جلد ۷۴ — ستمبر ۱۹۷۰ — عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

۵۔ الف ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۶ | ستمبر ۱۹۷۱ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ | عدد ۱

مغربی پاکستان		مشرقی پاکستان
چندہ سالانہ: آٹھ روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن	بذریعہ ہوائی ڈاک
فی پرچہ: ۸۰ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور	فی پرچہ ۹۰ پیسے۔ سالانہ ۱۰ روپے
		عام ڈاک سے: فی پرچہ ۸۰ پیسے۔ سالانہ ۸ روپے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کی گزشتہ تین اشاعتوں میں ہم نے معاشرے کے مختلف حلقوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی تھیں۔ اس مرتبہ ہم پوری قوم سے چند باتیں کہنا چاہتے ہیں اور اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

یہ بات تو بالکل ناقابلِ تصوّر ہے کہ پاکستان کا کوئی باشندہ اس ملک کو تباہ کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتا ہے۔ چند گنے چنے افراد کو چھوڑ کر، جو ہر قوم میں اپنے ملک سے دانستہ غدّاری کرنے والے نکل ہی آتے ہیں، اس ملک کے عام لوگ خدا کے فضل سے پاکستان کے دل و جان سے خیر خواہ ہیں اور اسے ایک آزاد خوشحال فلاحی مملکت کی حیثیت سے دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ پاکستان کے مسلمان تو ایک طرف رہے پُوری دنیا کے مسلمان اس خطۂ ارضی سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار اس خدشے کا اظہار کر چکے ہیں کہ خدانخواستہ اگر یہ ملک برباد ہو گیا تو پُوری دنیائے اسلام کو خطرہ لاحق ہو جائے گا جس ملک کی اس قدر اہمیت ہے اس کے باشندوں کو اوّل تو ہر قدم پر، مگر بالخصوص فیصلہ کُن مراحل پر، انتہائی تدبُّر کا ثبوت دینا چاہیے کیونکہ ایک لمحہ کی غفلت اور بے پروائی بڑے سنگین نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اس ضمن میں پہلی بات جو باشندگانِ ملک کے اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے وہ موجودہ انتخابات کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ ہمارے ملک کے باشندوں کی چونکہ اچھی طرح سیاسی تربیت نہیں ہوئی اس لیے

انتخابات لڑنے والے یہ سمجھ کر میدان میں کودتے ہیں کہ ان میں کامیاب ہوتے ہی وہ حکومت کے ایوانوں میں پہنچ جائیں گے اور وہاں ان کے لیے دنیوی فوائد کا سم سم کھل جائے گا۔ ادھر انتخابات لڑانے والے ماہرین ان مواقع کو غنیمت جان کر اچھی طرح سودے بازی کرتے ہیں اور اپنے ضمیر و ایمان کے نقد دام وصول کرنے کے علاوہ مستقبل کی مراعات کی بھی ضمانت لے لیتے ہیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کی عظیم اکثریت ان انتخابات کو محض ہنگامہ آرائی سمجھتی ہے اور ذات برادری کے چکر میں پڑ کر یا چودھراہٹ کے دباؤ میں آکر، یا طرح طرح کے خوش آئند وعدے سن کر کوئی غلط فیصلہ کر ڈالتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ جو فیصلہ وہ کر رہی ہے، اس کا خمیازہ اسے خود ہی بھگتنا ہی ہوگا۔ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ عوام کے سامنے انتخابات کی اہمیت اچھی طرح واضح کی جائے۔ انتخابات کا اصل مقصد قوم کو یہ موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کرلے کہ اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے وہ کونسا نہج پسند کرتی ہے اور پھر اس نہج پر زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے کن لوگوں اور جماعتوں پر بھروسہ کرتی ہے۔

جس معاشرے کی عنانِ اختیار کسی مطلق العنان بادشاہ یا آمر کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس میں خواہ زندگی کی کتنی حرکت و حرارت موجود ہو مگر وہ معاشرہ ہمیشہ محلاتی سازشوں اور مسلح بغاوتوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ اس معاشرے کے افراد کو کبھی بھی ذہنی اطمینان اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والا دماغ اور ہر حساس دل معاشرے کے حالات سے مختلف انداز سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں قومی فلاح و بہبود کا الگ نقشہ بناتا ہے اور اس بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ وہ اسی کے مطابق ملک کی تعمیرِ نو کرے۔ جن ممالک میں انتخابات کے ذریعے رائے عامہ کو برسرِ اقتدار آنے کی اجازت نہیں دی جاتی وہاں اضطراب کی لہریں اور تبدیلی کی خواہشات مسلح انقلاب کی صورت اختیار کرتی ہیں اور مختلف گروہ اپنے بھائی بندوں کے خون سے ہولی کھیل کر مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں اور جب تک وہ اس پر براجمان رہتے ہیں اس وقت تک وہ اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ کے دہانے

پر کھڑا محسوس کرتے ہیں۔
کسی انسانی معاشرے کے لیے بھیڑوں کا گلہ بن جانا بالکل ناممکن ہے۔ پھر یہ بات بھی قرین قیاس نہیں کہ انسان بالکل جمود کا شکار ہو جائے اور اس کے اندر تبدیلی کی کوئی خواہش سرے سے پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ جب یہ دونوں باتیں ناممکنات میں سے ہیں تو کسی معاشرے کے اجتماعی ڈھانچوں میں تغیر اور عنانِ اختیار سنبھالنے والے ہاتھوں میں تبدیلی بھی فطری چیزیں ہیں۔ اگر یہ کام ووٹ کے ذریعے پُرامن طریق سے سرانجام نہ دیئے جائیں تو پھر گولی کے ذریعے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا اہلِ پاکستان پر یہ احسان عظیم ہے کہ اُس نے اس قوم کو یہ سنہری موقع فراہم کیا ہے کہ وہ آمریت، استبداد اور فوجی حکمرانی سے نجات حاصل کر کے جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو۔ تاریخ میں اس قسم کے مواقع شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی کوئی بدنصیب قوم جب ایک مرتبہ فوجی آمریت کی گرفت میں آجاتی ہے تو پھر کشت و خون اس کا معمول بن جاتا ہے اور وہ اس لعنت سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ ہمارے ہاں نہ تو فوجی انقلاب کی وجہ سے اس ملک کی سرزمین اس کے باشندوں کے خون سے لالہ زار بنی اور نہ یہ استبداد یہاں مستقل قدم جما سکا۔ سابق صدر کچھ اسی طرح کے عزائم لے کر میدان میں اترے تھے اور دس سال کے عرصہ میں انہوں نے مستقل طور پر آمریت کے جھنڈے گاڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر قوم کے اجتماعی ضمیر نے ان کے اس عزم کی تکمیل نہ ہونے دی اور انہیں بالآخر میدان سے ہٹنا پڑا۔ جنرل یحییٰ نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلے ہی دن سے اس امر کا اعلان کر دیا کہ وہ جلد از جلد جمہوریت بحال کرنے کے خواہشمند ہیں۔ چنانچہ اب تک انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے بارے میں دوسری شکایتیں تو کی جا سکتی ہیں مگر یہ شکایت نہیں کی جا سکتی کہ وہ جمہوریت بحال کرنے کے وعدے میں مخلص نہیں ہیں۔ اگر یہ ملک خون خرابے کے بغیر آمریت کی راہ سے ہٹ کر جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو جائے تو یہ قادرِ مطلق کا اس قوم پر بہت بڑا احسان اور فضل ہو گا۔ یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ایسی تبدیلی ہے جس کی پوری تاریخ انسانی

میں چند مثالیں ہی ملتی ہیں۔

پھر اس ملک کے باشندوں کو ان انتخابات کے بارے میں یہ بھی اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ یہ نظریاتی اعتبار سے بھی فیصلہ کن اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمارے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اِس ملک میں جو اسلام کے نام پر اور اسلام کے لیے بنا ہے، آئندہ انتخابات میں ہمیں از سرِ نو اس طے شدہ امر کو پھر سے طے کرنا ہے کہ اس ملک کی تعمیر اسلام کی اساس پر ہو گی۔ یہ بات تو ہم پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی اچھی طرح طے کر چکے تھے، مگر بدقسمتی سے اس ملک میں مختلف طبقے جس قسم کی ریشہ دوانیاں کرتے رہے ہیں ان سے اس اساس کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کئی قسم کے خدشات پیدا ہو گئے ہیں اور چند افراد اس امر کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ملک کی اس اسلامی اساس کو بدل کر یہاں باہر سے درآمد کردہ ملحدانہ نظریات پھیلائے جائیں اور ان کی عملداری قائم کی جائے۔ اس بنا پر اہلِ پاکستان ان انتخابات میں ایک بہت بڑی آزمائش سے گزرنے والے ہیں۔ انہیں اب نہایت واضح طور پر یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ اسلام کے سوا اس ملک کی کوئی دوسری نظریاتی اساس تسلیم نہیں کرتے اور اس خطۂ پاک کو اسلام اور صرف اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔ یہ انتخابات اُس مقدس عہد کی تجدید کی حیثیت رکھتے ہیں جو برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطلب و مقصد بیان کرتے ہوئے خدا اور خلق کے سامنے باندھا تھا۔ ان انتخابات کے ذریعے انہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اپنے عہد پر بدستور قائم ہیں۔ یہ انتخابات اس مرحلہ پر فی الحقیقت الحاد اور اسلام کے مابین استصواب ہیں کیونکہ ملّت کو قطعی طور پر اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اسلام کے سوا ہر دوسری چیز کو باطل سمجھتی ہے اور اس بنا پر اس خطۂ پاک میں کوئی غیر اسلامی نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس ملک کی عظیم اکثریت نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے انتخابات میں غیر اسلامی عناصر اور قوتوں کو شکست فاش دے دی تو پھر الحاد کو کسی صورت میں بھی سر اٹھانے کا موقع نہ ملے گا۔ لیکن اگر اس نے ان انتخابات کو محض ہنگامہ آرائی

کا شغلہ سمجھ کر اس میں غیر سنجیدگی اور عدمِ تدبّر کا مظاہرہ کیا تو پھر کفر و الحاد جری ہو جائے گا اور اس میں یہ حوصلہ پیدا ہو گا کہ جو کام وہ اسمبلیوں میں گھس کر انجام نہیں دے سکا اُسے اپنی قوت کے بل بوتے پر غیر آئینی طریقوں سے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

ہر پاکستانی کو ووٹ دیتے وقت سب سے پہلے اپنے ضمیر سے یہ پوچھنا چاہیے کہ اسلام کے معاملے میں کونسی جماعت سب سے زیادہ مخلص ہے اور کون اس بات کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اجتماعی زندگی کا کوئی ایسا جامع نقشہ بنا سکے جو اسلامی نظام کا ہر اعتبار سے مظہر بھی ہو اور جس کے مطابق دَورِ جدید میں زندگی کی عملاً تعمیر بھی کی جا سکتی ہو۔

خلوص اگرچہ انسان کی داخلی کیفیت کا نام ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، لیکن کوئی شخص ہو یا جماعت۔ اس کی زندگی میں بہرحال ایسی علامات ضرور ظاہر ہوتی ہیں جن سے لوگ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے قول میں مخلص ہے یا نہیں۔ اخلاص کی پرکھ دو باتوں سے کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ انسان جن افکار و نظریات کا علمبردار ہے اس کی عملی زندگی میں ان کی جھلک موجود ہو۔ دوسرے اُن افکار و نظریات کے ساتھ اس کی وابستگی دیرپا ہو اور تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ کوئی تحریص و تخویف اُسے اپنے مسلک سے نہیں ہٹا سکی ہے۔

بعض لوگ بڑے اضطراب کے عالم میں یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ اس ملک کی ہر جماعت اسلامی نظام کے قیام کی دعویدار ہے آخر ہم کس طرح یہ فیصلہ کریں کہ کون اس دعوے میں مخلص ہے۔ یہ اعتراض بڑا سطحی اور یہ اضطراب بڑا بے معنی ہے۔ ذاتی زندگی میں ہمارے پاس کئی لوگ مختلف دعوے لے کر آتے ہیں، مگر محض دعوے کی بنیاد پر ہم ان پر بھروسا نہیں کرتے، بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص اپنے دعوے میں کس حد تک کھرا اور سچا ہے۔ اگر ذاتی زندگی میں یہ پرکھ مشکل نہیں تو قومی معاملات میں ہمارے لیے کیسے موجب پریشانی

بن سکتی ہے۔ کسی جماعت کا اخلاص تو بآسانی پرکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک فرد کی حیثیت سے تو انسان اپنے آپ کو کچھ مدت تک اور کسی حد تک چھپا سکتا ہے مگر کوئی جماعت جو ہزاروں افراد پر مشتمل ہوتی ہے، جس کا دائرہ کار بڑا وسیع ہوتا ہے، اور جس کے افکار و اعمال صبح و شام لاکھوں انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، وہ آخر دلوں کے کھوٹ اور نیتوں کے فساد کو کس طرح عرصہ دراز تک اخفا میں رکھ سکتی ہے؟ اجتماعی زندگی کی نفسیات یہی ہے کہ قول اور عمل میں تضاد اختیار کرنے کے ساتھ ہی اندر کے سارے بھید خود بخود باہر آ جاتے ہیں۔ اسی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اجتماعی جدوجہد کے جھٹکے اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ جو کچھ بھی اس جماعت کے اندر ہوتا ہے وہ فوراً باہر آ جاتا ہے۔ دوسرے کسی جماعت کے تمام افراد اتنے عیار اور چالاک نہیں ہوتے کہ وہ سب مل کر اپنی نیت کے فساد کو اجتماعی طور پر چھپا سکیں۔ اب کسی جماعت کے دعوائے اسلام کو پرکھنے کے لیے چند باتوں کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے۔

جو جماعتیں اسلام کا نام لیتی ہیں ان کے ماضی پر نگاہ ڈالی جائے۔ خصوصاً اگر انہیں کبھی اختیارات کی باگیں سونپی گئی ہوں تو اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ انہوں نے اُس وقت اپنے اختیارات سے دین کو نافذ کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے؟ جس طرح کسی فرد کے کردار کا صحیح اندازہ اس کی باتوں سے نہیں بلکہ اس کے عمل سے کیا جاتا ہے اسی طرح کسی جماعت کے کردار اور اخلاص کا اندازہ اس کے زبانی دعووں سے نہیں بلکہ اُسی کے اُس دَور کے طرزِ عمل سے کیا جاتا ہے جب وہ صاحبِ اختیار تھی۔ اگر اسی ایک معیار کو سامنے رکھ لیا جائے تو اصل صورت کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

باقی رہیں وہ جماعتیں جنہیں ابھی تک تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کا موقع نہیں ملا ہے ان کے بارے میں بھی کسی نتیجے پر پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے بالکل اسی طرح جماعتیں اپنے ارکان اور حامیوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جماعت کا مزاج لازمی طور پر اس کے کارکنوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی مزاج کو دیکھ کر ان کے دعوائے اسلام کو بآسانی پرکھا جا سکتا ہے۔

جن لوگوں کے افکار و اعمال، جن کی انفرادی زندگیاں اور جن کی اجتماعی سرگرمیاں سب اسلام کی ضد ہوں ان کی اسلام سے وابستگی کے دعوے کو کوئی فاترالعقل ہی تسلیم کر سکتا ہے۔

کسی جماعت کے اخلاص فی الاسلام کو جانچنے کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا اس میں فی الواقع یہ صلاحیت بھی موجود ہے یا نہیں کہ وہ موجودہ دَور کی ایک جدید ریاست کو اسلامی احکام و تعلیمات کے مطابق چلا سکے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اس جماعت میں اسلامی علوم اور جدید علوم، دونوں کے جاننے والے اچھی خاصی تعداد میں موجود ہوں تاکہ حالات کو صحیح طور پر سمجھ کر اسلامی تعلیمات کا انطباق کیا جا سکے۔ جس طرح محض جدید علوم کے ماہرین اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے اسی طرح صرف قدیم علوم کے ماہرین بھی اس فرض کو کما حقہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ اسلام سے گہری واقفیت اور دورِ جدید کے افکار و رجحانات اور احوال و ضروریات سے شناسائی، یہ دونوں چیزیں یکساں ضروری ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ملک کی تمام جماعتوں کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ انہوں نے علمی میدان میں کیا کام کیا ہے اور ان میں کونسی جماعت ایسی ہے جس نے زندگی کے ہر گوشے اور نظامِ حکومت، نظامِ معیشت، نظامِ تعلیم، اور نظامِ تہذیب و تمدن کے ہر پہلو کے متعلق اسلامی تعلیمات کا ایک ایسا واضح نقشہ لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے جو نئی تعلیم یافتہ نسل کو اس بات پر مطمئن کر سکے کہ فی الواقع اِس دَور میں ایک جدید ریاست اسلامی اصولوں پر چلائی جا سکتی ہے، اور اس کے ساتھ اس نے موجودہ زمانے کے افکار و رجحانات کی غلط رعایت کر کے اسلامی احکام و تعلیمات میں قطعاً کوئی معذرت خواہانہ تغیّر و تبدل نہیں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دینی طبقوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو نہ خود یہ ضرورت پوری کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اور نہ دوسرے کو یہ کام کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ شب و روز اس کام میں کیڑے ڈالنے اور طرح طرح کے اتہامات لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ملک اہلِ علم اور اہلِ نظر اور بے غرض دینداروں سے خالی نہیں ہے۔ وہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ خدمت اس ملک کی کس جماعت نے انجام دی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس جماعت نے اس نوعیت کا کوئی کام سرانجام نہیں دیا

تفہیم القرآن

المُدَّثِّر

ہر متنفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے[۳۰]، دائیں بازو والوں کے سوا[۳۱]، جو جنتوں میں ہوں گے۔ وہاں وہ مجرموں سے پوچھیں گے[۳۲] "تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟" وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے[۳۳]، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے[۳۴]، اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں

[۳۰] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۱۶۔

[۳۱] بالفاظ دیگر بائیں بازو والے تو اپنے کسب کے بدلے میں پکڑ لیے جائیں گے، لیکن دائیں بازو والے اپنا فکِّ رہن کرالیں گے (دائیں بازو اور بائیں بازو کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد پنجم، تفسیر سورۂ واقعہ، حاشی ۵-۶)

[۳۲] اس سے پہلے کئی مقامات پر قرآن مجید میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں میل دُور ہونے کے باوجود جب چاہیں گے ایک دوسرے کو کسی آلے کی مدد کے بغیر دیکھ سکیں گے اور ایک دوسرے سے براہِ راست گفتگو کرسکیں گے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، الاعراف، آیات ۴۴ تا ۵۰، حاشیہ ۳۵۔ جلد چہارم، الصّافات، آیات ۵۰ تا ۵۷، حاشیہ ۳۲۔

[۳۳] مطلب یہ ہے کہ ہم اُن لوگوں میں سے نہ تھے جنھوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو مان کر خدا کا وہ اولین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے، یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اُس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے لیکن

کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے، اور روزِ جزاء کو جھوٹ قرار دیتے تھے، یہاں تک کہ ہمیں اُس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا۔[۳۵] اُس وقت سفارش کرنے والوں کی کوئی سفارش ان کے کسی کام نہ آئے گی۔[۳۶]

نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جلنے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔

۳۴۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھنا اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کو کھانا نہ کھلانا اسلام کی نگاہ میں کتنا بڑا گناہ ہے کہ آدمی کے دوزخی ہونے کے اسباب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

۳۵۔ یعنی مرتے دم تک ہم اسی روش پر قائم رہے یہاں تک کہ وہ یقینی چیز ہمارے سامنے آگئی جس سے ہم غافل تھے۔ یقینی چیز سے مراد موت بھی ہے اور آخرت بھی۔

۳۶۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے مرتے دم تک یہ روش اختیار کیے رکھی ہو ان کے حق میں اگر کوئی شفاعت کرنے والا شفاعت کرے بھی تو اسے معافی نہیں مل سکتی۔ شفاعت کے مسئلے کو قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو یہ جاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی کہ شفاعت کون کر سکتا ہے اور کون نہیں کر سکتا، کس حالت میں کی جا سکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جا سکتی، کس کے لیے کی جا سکتی ہے اور کس کے لیے نہیں کی جا سکتی، اور کس کے حق میں وہ نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دنیا میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط عقائد بھی ہیں، اس لیے قرآن نے اس مسئلے کو اتنا کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں: البقرہ، ۲۵۵۔ الانعام، ۹۴۔ الاعراف، ۵۳۔ یونس، ۳۔۱۸۔ مریم، ۸۷۔ طٰہٰ، ۱۰۹۔ الانبیاء، ۲۸۔ سبا، ۲۳۔ الزُّمر، ۴۳۔۴۴۔ المؤمن، ۱۸۔ الزُّخرف ۸۶۔ النجم ۲۶۔ النبا، ۳۷۔۳۸۔ تفہیم القرآن میں جہاں جہاں یہ آیات آئی ہیں ہم نے ان کی اچھی طرح تشریح کر دی ہے۔

آخر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اِس نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔[۳۷] بلکہ اِن میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے نام کھُلے خط بھیجے جائیں۔[۳۸] ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔[۳۹] ہرگز

---

۳۷ یہ ایک عربی محاورہ ہے۔ جنگلی گدھوں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ خطرہ بھانپتے ہی وہ اِس قدر بدحواس ہو کر بھاگتے ہیں کہ کوئی دوسرا جانور اس طرح نہیں بھاگتا۔ اس لیے اہلِ عرب غیر معمولی طور پر بدحواس ہو کر بھاگنے والے کو ان جنگلی گدھوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو شیر کی بُو یا شکاریوں کی آہٹ پاتے ہی بھاگ پڑے ہوں۔

۳۸ یعنی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مقرر فرمایا ہے تو وہ مکہ کے ایک ایک سردار اور ایک ایک شیخ کے نام ایک خط لکھ کر بھیجے کہ محمدؐ ہمارے نبی ہیں، تم ان کی پیروی قبول کرو۔ اور یہ خط ایسے ہوں جنہیں دیکھ کر انہیں یقین آجائے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے یہ لکھ کر بھیجے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن مجید میں کفارِ مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم نہ مانیں گے جب تک وہ چیز خود ہم کو نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے" (الانعام، ۱۲۴)۔ ایک دوسری جگہ ان کا یہ مطالبہ نقل کیا گیا ہے کہ آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب لا کر ہمیں دیں جسے ہم پڑھیں (بنی اسرائیل ۹۳)

۳۹ یعنی اِن کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے یہ مطالبے پورے نہیں کیے جاتے، بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت سے بے خوف ہیں۔ انہوں نے سب کچھ اِسی دنیا کو سمجھ رکھا ہے اور انہیں یہ خیال نہیں ہے کہ اِس دنیا کی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے جس میں اِن کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔ اِسی چیز نے اِن کو دنیا میں بے فکر اور غیر ذمہ دار بنا دیا ہے۔ یہ حق اور باطل کے سوال کو سرے سے بے معنی سمجھتے ہیں، کیونکہ اِنہیں دنیا میں کوئی حق ایسا نظر نہیں آتا جس کی پیروی کا نتیجہ لازماً دنیا میں اچھا ہی نکلتا ہو، اور نہ کوئی باطل ایسا نظر آتا ہے جس کا نتیجہ دنیا میں ضرور بُرا ہی نکلا کرتا ہو۔ اس لیے یہ اِس مسئلے پر غور کرنا لاحاصل سمجھتے ہیں کہ فی الواقع حق کیا ہے اور باطل کیا۔ یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ قابلِ غور اگر ہو سکتا ہے تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں حق کا انجام لازماً اچھا اور باطل کا انجام لازماً بُرا ہو گا۔ ایسا شخص تو ان

نہیں[۵۲]، یہ تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرلے۔ اور یہ کوئی سبق حاصل نہ کریں گے اِلّا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے[۵۳]۔ وہ اِس کا حق دار ہے کہ اُس سے تقویٰ کیا جائے اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے[۵۴]۔ ع

معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لائے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کریگا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے۔ لیکن آخرت کا منکر جو سرے سے تلاشِ حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نئے نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جائے، وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانا ڈھونڈ نکالے گا۔ یہی بات ہے جو سورۂ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ "اے نبی، اگر ہم تمہارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھُو کر بھی دیکھ لیتے تو جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے" (الانعام، ۷)۔

[۵۲] یعنی ان کا ایسا کوئی مطالبہ ہرگز پُورا نہ کیا جائے گا۔

[۵۳] یعنی کسی شخص کا نصیحت حاصل کرنا سراسر اُس کی اپنی مشیت ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ اُسے نصیحت اُسی وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ اللہ کی مشیت بھی یہ ہو کہ وہ اُسے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ دوسرے الفاظ میں یہاں اِس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ بندے کا کوئی فعل بھی تنہا بندے کی اپنی مشیت سے ظہور میں نہیں آتا، بلکہ ہر فعل اُسی وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے جب خدا کی مشیت بندے کی مشیت سے مل جاتی ہے۔ یہ ایک نہایت نازک مسئلہ ہے جسے نہ سمجھنے سے انسانی فکر بکثرت ٹھوکریں کھاتی ہے مختصر الفاظ میں اس کو یُوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر اس دنیا میں ہر انسان کو یہ قدرت حاصل ہوتی کہ جو کچھ وہ کرنا چاہے کر گزرے تو ساری دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ جو نظم اِس جہان میں قائم ہے وہ اِسی وجہ سے ہے کہ اللہ کی مشیت ساری مشیتوں پر غالب ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرنا چاہے وہ اُسی وقت کر سکتا ہے جبکہ اللہ بھی یہ چاہے کہ انسان کو وہ کام کرنے دیا جائے۔ یہی معاملہ ہدایت اور ضلالت کا بھی ہے۔ انسان کا محض خود ہدایت چاہنا اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ اسے ہدایت مل جائے، بلکہ اُسے ہدایت اُس وقت ملتی ہے

جب اللہ اُس کی اِس خواہش کو پُورا کرنے کا فیصلہ فرما دیتا ہے۔ اسی طرح ضلالت کی خواہش بھی محض بندے کی طرف سے ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ جب اللہ اس کے اندر گمراہی کی طلب پاکر یہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ اسے غلط راستوں میں بھٹکنے دیا جائے تب وہ ان راہوں میں بھٹک نکلتا ہے جن پر اللہ اسے جانے کا موقع دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی چور بننا چاہے تو محض اس کی یہ خواہش اِس کے لیے کافی نہیں ہے کہ جہاں جس کے گھر میں گھس کر وہ جو کچھ چاہے چرا لے جائے، بلکہ اللہ اپنی عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کے مطابق اس کی اس خواہش کو جب اور جس قدر اور جس شکل میں پُورا کرنے کا موقع دیتا ہے اسی حد تک وہ اسے پُورا کر سکتا ہے۔

۱۲ یعنی تمہیں اللہ کی ناراضی سے بچنے کی جو نصیحت کی جارہی ہے وہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ کو اس کی ضرورت ہے اور اگر تم ایسا نہ کرو تو اس سے اللہ کا کوئی نقصان ہوتا ہے، بلکہ یہ نصیحت اس بنا پر کی جا رہی ہے کہ اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کے بندے اس کی رضا چاہیں اور اس کی مرضی کے خلاف نہ چلیں۔

۱۳ یعنی یہ اللہ ہی کو زیب دیتا ہے کہ کسی نے خواہ اس کی کتنی ہی نافرمانیاں کی ہوں، جس وقت بھی وہ اپنی اس روش سے باز آجائے اللہ اپنا دامنِ رحمت اس کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔ اپنے بندوں کے لیے کوئی جذبۂ انتقام وہ اپنے اندر نہیں رکھتا کہ ان کے قصوروں سے وہ کسی حال میں درگزر ہی نہ کرے اور انہیں سزا دیئے بغیر نہ چھوڑے۔

تفہیم القرآن

القیامہ

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْقِیٰمَۃ کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے، اور یہ صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ اِس سُورہ کا عنوان بھی ہے کیونکہ اس میں قیامت ہی پر بحث کی گئی ہے۔

زمانۂ نزول | اگرچہ کسی روایت سے اِس کا زمانۂ نزول معلوم نہیں ہوتا لیکن اس کے مضمون میں ایک داخلی شہادت ایسی موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ آیت ۱۵ کے بعد یکایک سلسلۂ کلام توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا جاتا ہے کہ "اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو، اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔" اس کے بعد آیت ۲۰ سے پھر وہی مضمون شروع ہو جاتا ہے جو ابتدا سے آیت ۱۵ تک چلا آرہا تھا۔ یہ جملۂ معترضہ اپنے موقع و محل سے بھی اور روایات کی رُو سے بھی اِس بنا پر دورانِ کلام میں وارد ہُوا ہے کہ جس وقت حضرت جبریلؑ یہ سُورہ حضورؐ کو سنا رہے تھے اُس وقت آپ اِس اندیشے سے کہ کہیں بعد میں بھول نہ جائیں، اس کے الفاظ اپنی زبانِ مبارک سے دُہراتے جا رہے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانہ کا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو نزولِ وحی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا تھا اور ابھی آپ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اچھی طرح نہیں پڑی تھی۔ قرآن مجید میں اس کی دو مثالیں اور

بھی ملتی ہیں: ایک سورہ طٰہٰ میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ "اور دیکھو، قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک کہ تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے" (آیت ۱۱۴)۔ دوسرے سورہ اعلیٰ میں جہاں حضورؐ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ "ہم عنقریب تم کو پڑھوا دینگے پھر تم بھولو گے نہیں" (آیت ۶)۔ بعد میں جب حضورؐ کو وحی اخذ کرنے کی اچھی طرح مشق ہو گئی تو اس طرح کی ہدایات دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسی لیے قرآن میں ان تین مقامات کے سوا اس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔

موضوع اور مضمون یہاں سے آخر کلام اللہ تک جو سورتیں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر اپنے مضمون اور انداز بیان سے اُس زمانہ کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں جب سورۂ مدّثر کی ابتدائی سات آیات کے بعد نزولِ قرآن کا سلسلہ بارش کی طرح شروع ہوا اور پے در پے نازل ہونے والی سورتوں میں ایسے پُرزور اور مؤثر طریقہ سے نہایت جامع اور مختصر فقروں میں اسلام اور اس کے بنیادی عقائد اور اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا گیا اور اہل مکہ کو ان کی گمراہیوں پر متنبہ کیا گیا جس سے قریش کے سردار بوکھلا گئے اور پہلا حج آنے سے پہلے حضورؐ کو زک دینے کی تدبیریں سوچنے کے لیے انہوں نے وہ کانفرنس منعقد کی جس کا ذکر ہم سورہ مُدّثر کے دیباچہ میں کر چکے ہیں۔

اِس سورہ میں منکرین آخرت کو خطاب کر کے ان کے ایک ایک شبہ اور ایک ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، بڑے مضبوط دلائل کے ساتھ قیامت اور آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کا ثبوت دیا گیا ہے، اور یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ بھی آخرت کا انکار کرتے ہیں ان کے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی عقل اسے ناممکن سمجھتی ہے بلکہ اس کا اصل محرک یہ ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس اسے ماننا نہیں چاہتیں۔ اس کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ جس وقت کے آنے کا تم انکار کر رہے ہو وہ آ کر رہے گا، تمہارا سب

کیا دھرا تمہارے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا، اور حقیقت میں تو اپنا نامۂ اعمال دیکھنے سے بھی پہلے تم میں سے ہر شخص کو خود معلوم ہوگا کہ وہ دنیا میں کیا کر کے آیا ہے، کیونکہ کوئی شخص بھی اپنے آپ سے ناواقف نہیں ہوتا، خواہ وہ دنیا کو بہکانے اور اپنے ضمیر کو بہلانے کے لیے اپنی حرکات کے لیے کتنے ہی بہانے اور عذرات تراشتا رہے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

نہیں[1]، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی[2]۔

---

[1] کلام کی ابتدا "نہیں" سے کرنا خود بخود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے سے کوئی بات چل رہی تھی جس کی تردید میں یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اور آگے کا مضمون آپ ہی ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ بات قیامت اور آخرت کی زندگی کے بارے میں تھی جس کا اہلِ مکہ انکار کر رہے تھے بلکہ ساتھ ساتھ مذاق بھی اڑا رہے تھے۔ اس طرزِ بیان کو اس مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر آپ محض رسول کی صداقت کا اقرار کرنا چاہتے ہوں تو آپ کہیں گے "خدا کی قسم رسول برحق ہے"۔ لیکن اگر کچھ لوگ رسول کی صداقت کا انکار کر رہے ہوں تو آپ جواب میں اپنی بات یوں شروع کریں گے کہ "نہیں، خدا کی قسم رسول برحق ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اصل بات یہ ہے۔

[2] قرآن مجید میں نفسِ انسانی کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ نفس جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے۔ اس کا نام نفسِ اَمّارہ ہے۔ دوسرا وہ نفس جو غلط کام کرنے یا غلط سوچنے یا بری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے۔ اس کا نام نفسِ لوّامہ ہے اور اسی کو ہم آج کل کی اصطلاح میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ نفس جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے اس کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا ہے کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے

کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کریگا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر ان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے؟ جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اِس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اِس گمان بے اصل کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے، لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ ہست و بود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکی انسان کو جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔ لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اِس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد پھر انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ لوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اس کا ضمیر اسے کوئی برائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے قطع نظر اس سے کہ اس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس بُرائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اس کے برعکس صورت میں جبکہ اُسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟[۳] کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی

نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اِس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں اِس طرح کے ایک نفسِ لوامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوامہ زندگی بعد موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے ان کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم رہ جائے گا، اور اس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اِس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعد موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسخ یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اِس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائے گا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اس لامتناہی سلسلے میں بجائے اس کے کہ اس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اسی صورت میں پورا ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی صرف ایک زندگی ہو، اور پھر پوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پوری جزا اور سزا دے دی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۳۰)۔

۳ اوپر کی دو دلیلیں، جو قسم کی صورت میں بیان کی گئی ہیں، صرف دو باتیں ثابت کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ

انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں[۴]۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بد اعمالیاں کرتا رہے[۵]۔

دنیا کا خاتمہ (یعنی قیامت کا پہلا مرحلہ) ایک یقینی امر ہے۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد دوسری زندگی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر انسان کے ایک اخلاقی وجود ہونے کے منطقی اور فطری تقاضے پورے نہیں ہو سکتے، اور یہ امر ضرور واقع ہونے والا ہے، کیونکہ انسان کے اندر ضمیر کی موجودگی اس پر گواہی دے رہی ہے۔ اب یہ تیسری دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ زندگی بعدِ موت ممکن ہے۔ مکہ میں جو لوگ اس کا انکار کرتے تھے وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، ان سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار برس پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پرزور جواب اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ "کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟" یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اِسی جسم کے ساتھ جی اٹھو گے، تو بلا شبہ تمہارا اِس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اِس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالقِ کائنات مانتا ہو، نہ اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اِس وقت موجود ہو اس کے بے شمار اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزاء کو جمع نہیں کر سکتا؟

[۴] یعنی بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمہارا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو درکنار، ہم تو اس بات پر

پوچھتا ہے "آخر کب آنا ہے وہ قیامت کا دن؟" پھر جب دیدے پتھرا جائیں گے اور چاند

بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم تک کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

۵ اس چھوٹے سے فقرے میں منکرینِ آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی ہے۔ ان لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کرتی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع وہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ اُن کے اس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً ان پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انہیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں اُسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں وہ اب تک کرتے رہے ہیں، آئندہ بھی ان کو اس کی کھلی چھوٹ ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اِن اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے دراصل اُن کی عقل انہیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفس اس میں مانع ہیں۔

۶ یہ سوال استفسار کے طور پر نہیں بلکہ انکار اور استہزاء کے طور پر تھا یعنی وہ یہ پوچھنا نہیں چاہتے تھے کہ قیامت کس روز آئے گی، بلکہ مذاق کے طور پر کہتے تھے کہ حضرت! جس دن کی آپ خبر دے رہے ہیں آخر وہ آتے آتے رہ کہاں گیا ہے؟

۷ اصل میں بَرِقَ الْبَصَرُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے لغوی معنی بجلی کی چمک سے آنکھوں کے چُندھیا جانے کے ہیں، لیکن عربی محاورے میں یہ الفاظ اِسی معنی کے لیے مخصوص نہیں ہیں بلکہ خوف زدگی، حیرت، یا کسی اچانک حادثہ سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اگر آدمی ہکّا بکّا رہ جائے اور اس کی نگاہ اُس پریشان کن منظر کی طرف جم کر رہ جائے جو اس کو نظر آ رہا ہو تو اس کے لیے بھی یہ الفاظ بولے جاتے ہیں۔ اسی مضمون کو قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے: اِنَّمَا یُؤَخِّرُھُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ، "اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لیے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی" (ابراہیم ۴۲)

بے نور ہو جائے گا اور چاند سورج ملا کر ایک کر دیئے جائیں گے[۸] اُس وقت یہی انسان کہے گا "کہاں بھاگ کر جاؤں؟" ہر گز نہیں، وہاں کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، اس روز تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھیرنا ہوگا۔ اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا[۹] بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں

---

[۸] یہ قیامت کے پہلے مرحلے میں نظامِ عالم کے درہم برہم ہو جانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہو جانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہو جانے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے بلکہ خود سورج بھی تاریک ہو جائے گا اور بے نور ہو جانے میں دونوں یکساں ہو جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمین یکایک اُلٹی چل پڑے گی اور اُس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند یک لخت زمین کی گرفت سے چھوٹ کر نکل جائے گا اور سورج میں جا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔

[۹] اصل الفاظ ہیں بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اُس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ کر آیا تھا جو اس کے بعد مدتہا ئے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اُسے کرنا چاہیے تھا مگر اُس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی اور بدی اس نے کی وہ بھی اسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اس سے بھی اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

پیش کرنے۔ — اے نبی، اِس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو،

۱۰؎ یعنی آدمی کا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھنے کی غرض در حقیقت یہ نہیں ہو گی کہ مجرم کو اس کا جُرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اس وجہ سے ضروری ہو گا کہ انصاف کے تقاضے برسرِ عدالت جرم کا ثبوت پیش کیے بغیر پورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا اسے بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے، لیکن اسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ حیلے اپنی چوری چھپانے کے لیے اختیار کر سکتا ہے، مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کفر یا دہریت یا شرک کا قائل ہے وہ در حقیقت اس کی ایماندارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اِس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اِن عقائد پر وہ کیوں جما ہُوا ہے اور اِن کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بد دیانت، ایک بدکردار، ایک حرام خور، اپنی بداعمالیوں کے لیے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آ جائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اِس کے باوجود اُس کو یہ علم تو بہر حال ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہو گا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔

۱۱؎ یہاں سے لے کر "پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے" تک کی پُوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم دیباچہ میں بیان کر آئے ہیں، نبوّت کے ابتدائی دور میں، جبکہ حضورؐ کو وحی

اِس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے پڑھ رہے ہوں اُس وقت

اخذ کرنے کی عادت اور مشق پوری طرح نہیں ہوئی تھی۔ آپ پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ جبریل علیہ السلام جو کلامِ الٰہی آپ کو سنا رہے ہیں وہ آپ کو ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں، اس لیے آپ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے ایسی ہی صورت اُس وقت پیش آئی جب حضرت جبریل سورۂ قیامہ کی یہ آیات آپ کو سنا رہے تھے چنانچہ سلسلۂ کلام توڑ کر آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں۔ اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے آپ مطمئن رہیں کہ اس کلام کا ایک لفظ بھی آپ نہ بھولیں گے نہ کبھی اسے ادا کرنے میں غلطی کر سکیں گے۔ یہ ہدایت فرمانے کے بعد پھر اصل سلسلۂ کلام "ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے" سے شروع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اِس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اِس مقام پر اِن فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اِس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد درس دیتے دیتے یکایک یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ توڑ کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے بعد آگے پھر اپنی تقریر شروع کر دے۔ یہ درس اگر جوں کا توں نقل کر کے شائع کر دیا جائے تو جو لوگ اس واقعہ سے واقف نہ ہونگے وہ اس سلسلۂ تقریر میں اِس فقرے کو بے جوڑ محسوس کرینگے۔ لیکن جو شخص اُس اصل واقعہ سے واقف ہوگا جس کی بنا پر یہ فقرہ درمیان میں آیا ہے وہ مطمئن ہو جائے گا کہ درس فی الحقیقت جوں کا توں نقل کیا گیا ہے، اُسے نقل کرنے میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

اوپر اِن آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے، بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مُسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباس کی

تم اِس کی قرأت کو غور سے سُنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے[۱۳]۔

یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ اِس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں، جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دُہرانے لگتے تھے۔ اس پر فرمایا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔۔۔۔ یہی بات شَعْبِی، ابن زید، ضَحّاک، حسن بصری، قَتادہ، مجاہد اور دوسرے اکابر مفسّرین سے منقول ہے۔

۱۲ے اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو جبریل علیہ السّلام قرآن پڑھ کر سُناتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پڑھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "جب ہم اُسے پڑھ رہے ہوں"۔

۱۳ے اِس سے گمان ہوتا ہے، اور بعض اکابر مفسّرین نے بھی اِس گمان کا اظہار کیا ہے، کہ غالباً ابتدائی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نزولِ وحی کے دوران ہی میں قرآن کی کسی آیت یا کسی لفظ یا کسی حکم کا مفہوم بھی جبریل علیہ السلام سے دریافت کر لیتے تھے، اس لیے حضورؐ کو نہ صرف یہ ہدایت کی گئی کہ جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت آپ خاموشی سے اس کو سنیں، اور نہ صرف یہ اطمینان دلایا گیا کہ اس کا لفظ لفظ ٹھیک ٹھیک آپ کے حافظہ میں محفوظ کر دیا جائے گا اور قرآن کو آپ ٹھیک اُسی طرح پڑھ سکیں گے جس طرح وہ نازل ہوا ہے، بلکہ ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم اور ہر ارشاد کا منشا اور مدّعا بھی پوری طرح آپ کو سمجھا دیا جائے گا۔

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔

اوّلاً، اِس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو

ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام و فرامین، اُس کے اشارات، اُس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم و مدعا حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔ لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالبِ قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہر حال الفاظِ قرآن کے ماسوا تھی۔ یہ وحیِ خفی کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے (قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب "سنّت کی آئینی حیثیت" میں صفحات ۹۴-۹۵- اور صفحات ۱۱۸ تا ۱۲۵ میں پیش کر دیئے ہیں)۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی آخر اسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی حد تک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریعی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ "اور اے نبی، یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اُتاری گئی ہے" (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۴۰)۔ اور قرآن میں چار جگہ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ (البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱۔ آلِ عمران، ۱۶۴۔ الجمعہ، ۲۔ ان سب آیات کی تشریح ہم "سنت کی آئینی حیثیت" میں صفحہ ۷۴ سے ۷۷ تک تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔

اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی صحیح و مستند، بلکہ فی الحقیقت سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور

عمل سے فرما دی ہے، کیونکہ وہ آپ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا اُس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحبِ ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً، قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی داں آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ اُن کا حقیقی مدعا کیا ہے اور اُن میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے۔ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ قرآن مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے۔ لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا۔ قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اِس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی داں یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلّم کو مقرر کر کے اپنی اِس اصطلاح کا مفہوم اُسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے تھے جو حکمِ صلوٰۃ پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اسی مطلب کی تعلیم آپ اُن سب لوگوں کو دیتے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول اور عمل سے

اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنّت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنّت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا، جس کی تفصیلات معتبر روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو اگلی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے اگلی نسلوں میں اس پر عملدرآمد ہوتے بھی دیکھا۔ اس ذریعۂ علم کو قبول کرنے سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمّہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں معاذاللہ وہ ناکام ہوگیا، کیونکہ یہ ذمّہ داری محض رسولؐ کو ذاتی حیثیت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعہ سے اُمّت کو کتاب الٰہی کا مطلب سمجھایا جائے، اور حدیث و سنّت کے ماخذِ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس ذمّہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے، اعاذنا اللہ من ذالک۔

اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تو لی تھیں، اُس سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وہی سکّے تو جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے گا؟ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امّت نے اوّل روز سے اِس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اور جتنا جتنا غلط باتوں کے اس ذاتؐ کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا اُتنا ہی زیادہ اِس امّت کے خیرخواہ اِس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے ممیز کیا جائے۔ صحیح و

غلط کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آکر حدیث و سنت کو ناقابلِ اعتبار ٹھیراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اپنی اِس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

تصحیح

تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۳، سطر ۶ میں غلطی سے اِذَا هُمۡ یَنۡکِثُوۡنَ لکھا گیا ہے۔ صحیح لفظ اِذَا هُمۡ یَنۡکُثُوۡنَ ہے۔ جن اصحاب کے پاس یہ کتاب موجود ہو وہ براہِ کرم اس کی تصحیح کر لیں۔

حضرت موسیٰؑ اور قبطی کا قتل

(از ملک غلام علی صاحب)

ایک صاحب نے رسائل و مسائل حصہ اوّل کی ایک عبارت پر بعض علمائے کرام کے اعتراضات نقل کر کے مجھ سے ان کے جواب کی فرمائش کی ہے۔ ذیل میں ان کا خط درج کر کے اس کا جواب عرض کر رہا ہوں:

"مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف بعض علماء آئے دن کوئی نہ کوئی اعتراض پھیلاتے اور تقریروں میں ان کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک اعتراض رسائل و مسائل حصہ اوّل کی ایک عبارت پر ہے جو عصمتِ انبیاء کے زیرِ عنوان درج ہے کہ نبی ہونے سے پہلے حضرت موسیٰؑ سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کر دیا۔ جب فرعون نے اس فعل پر ملامت کی تو انہوں نے بھرے دربار میں اس بات کا اقرار کیا کہ یہ فعل مجھ سے اس وقت سرزد ہوا تھا جب راہِ ہدایت مجھ پر نہ کھلی تھی۔ معترضین کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ نے جس کو قتل کیا تھا وہ فرعون کی قوم کا ایک کافر حربی فرد تھا جس کا قتل بالکل جائز بلکہ باعثِ ثواب تھا، کیونکہ فرعونی طاقتور اور اسرائیلی کمزور تھا اور اس کی مدد کرنا لازم تھا۔ پھر حضرت موسیٰؑ کا ارادہ قتل کا نہ تھا، اس لیے یہ فعل گناہ نہ تھا۔ ایک بے گناہ مظلوم کی امداد کوئی گناہ کا کام نہیں۔ ایک صاحب نے اس بات کو بھی غلط قرار دیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا یہ فعل نبی ہونے سے پہلے کا تھا، انہوں نے سورۂ قصص کے دوسرے رکوع کا حوالہ دیا ہے جس میں صاف طور پر مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ زور آور ہو گئے اور پختہ عمر کو پہنچ گئے تو اللہ نے ان کو نبوت کا علم

عطا کیا۔ پھر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو دو آدمیوں کو لڑتا ہوا پایا۔ نبوت کے بعد نبی کے کسی فعل پر گناہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

براہ کرم اس اعتراض کا تسلی بخش جواب دیں اور واضح کریں کہ یہ فعل نبوت سے قبل کا ہے یا بعد کا اور اس کی حقیقت و نوعیت کیا ہے؟ پھر اس مقام پر مولانا نے یہ جو لکھا ہے کہ "نبی کے معصوم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرشتوں کی طرح اس سے بھی خطا کا امکان سلب کر لیا گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ نبی اول تو دانستہ نافرمانی نہیں کرتا اور اگر اس سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس غلطی پر قائم نہیں رہنے دیتا"۔ اس عبارت پر بھی بعض علمارِ کرام، بالخصوص دیوبندی حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ انبیاءؑ ملائکہ سے ہر لحاظ سے افضل و برتر ہیں اور انبیاء کی عصمت کو فرشتوں کی عصمت سے فروتر یا مختلف قرار دینا توہینِ انبیاء ہے۔ اِس اعتراض کی حقیقت پر بھی روشنی ڈال دیں تو بہتر ہو گا"۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ہاتھ سے ایک قبطی کا قتل ہو جانا قرآن مجید میں صاف طور پر مذکور ہے۔ اب اگر اس واقعۂ قتل کی شدّت و اہمیت کم کرنے کے لیے یہ استدلال کیا جائے کہ یہ قتلِ عمد نہ تھا، مقتول ایک کافر و ظالم حربی تھا جس کا خون بہانا کسی صورت میں ممنوع نہ تھا، اس لیے یہ فعل سرے سے گناہ ہی نہ تھا، تو یہ استدلال متعدد وجوہ کی بنا پر محلِ نظر ہے۔

قرآن مجید میں بیان شدہ تفصیل اور اندازِ کلام سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی کہ یہ فعل گناہ نہ تھا بلکہ محض ایک خلافِ اَولیٰ کام تھا۔ قرآنِ مجید میں خود حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی طرف سے اس فعل کا گناہ ہونا تسلیم کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء میں فرمایا گیا ہے کہ جب رب العٰلمین نے حضرت موسیٰؑ کو قومِ فرعون کی طرف مبعوث کرنا چاہا تو انھوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے، اس لیے آپ ہارونؑ کو رسول بنا کر بھیجیں۔ اس کے ساتھ حضرت موسیٰؑ نے یہ عذر بھی پیش کیا:

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ میرے اوپر اُن کے ہاں ایک گناہ کا الزام ہے، پس

(الشعراء-۱۴) میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ کے نزدیک بھی یہ فعل ایسا تھا جو آپ کی تکذیب اور قتل کا باعث بن سکتا تھا اور منجملہ اُن وجوہ کے تھا جن کی بنا پر آپ بارِ نبوت اٹھانے میں متامل تھے۔ اس کے بعد اللہ نے حضرت ہارونؑ کو ان کا وزیر و مددگار بنایا اور دونوں کو فرعون کی طرف بھیجا۔ فرعون نے آپ کی دعوت کو رد کرتے ہوئے ایک تو اپنے احسان جتلائے کہ تم نے ہمارے ہاں پرورش پائی اور دوسرا اعتراض یہی کیا کہ تم نے ہمارا آدمی قتل کر کے ناشکری کا ثبوت دیا۔ حضرت موسیٰ نے پہلی بات کے جواب میں تو فرمایا کہ کیا تیرا احسان یہی ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟ لیکن دوسرے اعتراض کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ اس شخص کا قتل جائز و مباح تھا، اس میں میری کوئی خطا نہیں تھی، بلکہ یہ فرمایا:

فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ۔ میں نے وہ کام اُس وقت کیا تھا جبکہ میں راہ یاب نہ تھا۔

مقتول کے حربی اور مباح الدم ہونے والی بات اگرچہ بعض علماء نے کہی ہے، مگر یہ ایک کمزور قول ہے۔ اول تو اُس زمانے میں دارالاسلام اور دارالحرب کا کوئی وجود نہ تھا اور حضرت موسیٰ کسی دارالاسلام سے عارضی طور پر دارالحرب میں نہیں آگئے تھے کہ وہ جسے چاہتے قتل کر دیتے، بلکہ آپ اور آپ کی قوم مصر ہی میں متوطن تھی۔ پھر متعدد تفسیری اقوال بلکہ صحیح و مستند احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے لیے یہ قتل ممنوع تھا۔ حضرت موسیٰ نبوت سے قبل بھی بہرحال حضرت ابراہیمؑ و آلِ ابراہیم کی شریعت کے متبع تھے اور قانونِ ملکی کی پابندی بھی کسی حد تک ناگزیر تھی، اس لیے قتل خواہ وہ قتلِ خطا ہی کیوں نہ ہو، بہرحال جائز نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کا ارادہ قتل کا نہ تھا مگر جذبات کے زور اور شدّت میں آکر آپ ایسا بھرپور مُکّا ضرور رسید کر بیٹھے جو جان لیوا ثابت ہوا۔ بعض مفسرین نے لفظ ضالین سے جاہلین، یعنی "غصے اور طیش میں آجانے والے" مراد لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ غیظ و غضب میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے۔

سورۂ قصص میں اس واقعے کی مزید تفصیل مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی لڑ رہے تھے جن میں سے ایک اسرائیلی اور دوسرا قبطی تھا۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ سے مدد طلب کی۔ آپ نے قبطی کو ایسا مکا مارا کہ اس کا کام ہی تمام کر دیا۔ اس کے بعد قرآن مجید میں آتا ہے:

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ‎ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ‏۔ (القصص ۱۵-۱۶)	موسیٰ نے کہا کہ یہ تو شیطان کی حرکت ہے، وہ گمراہ کن کھلا دشمن ہے۔ بولے، میرے رب! میں نے ظلم کیا اپنے اوپر پس مجھے بخش دے۔ تب اللہ نے بخش دیا۔ وہی ہے بخشنے والا، رحم کرنے والا۔

اب اگر یہ فعلِ قتل جائز و مباح ہوتا تو اسے عملِ شیطان اور اپنے نفس پر ظلم قرار دینے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اس کو بخش دینے کا کیا موقع و محل تھا؟ ظلم و ضلالت کے الفاظ بھی کوئی معمولی الفاظ نہیں ہیں جو کسی معمولی واقعہ کے لیے قرآن میں کبھی استعمال ہوتے ہوں۔

ان آیات کی تفسیر میں ابن جریرؒ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

اساء موسیٰ حیث اساء وھو شدید الغضب شدید القوۃ	حضرت موسیٰ سے یہ برائی سرزد ہو گئی اور وہ بڑے غصیلے اور زور آور تھے۔

ربّ انی ظلمت نفسی کی تفسیر میں ابن جریرؒ فرماتے ہیں:

ربّ انی ظلمت نفسی بقتل النفس التی لم تامرنی بقتلھا فاعف عن ذنبی ذلک واسترہ علیّ ولا تواخذنی بہ فتعاقبنی علیہ	اے میرے رب میں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ ایسی جان کو قتل کیا جس کے قتل کا حکم تو نے نہ دیا تھا پس میرا گناہ معاف فرما، میری ستر پوشی کر اور اس پر مواخذہ و عتاب نہ کر۔

اس تاویل کے حق میں ابن جریرؒ نے ابن جُریج کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ حکمِ شریعت کے بغیر قتل جائز نہ تھا اور حضرت موسیٰ کے لیے یہ کام کرنے کا حکم نہیں تھا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس اسرائیلی کی حمایت میں حضرت موسیٰؑ نے قبطی کو قتل کیا تھا، وہ بھی کوئی اچھا آدمی نہ تھا۔ مقاتل کا یہ قول

تفاسیر میں مذکور ہے کہ یہ شخص نسلاً اسرائیلی ہونے کے باوجود کافر تھا۔ علامہ نیساپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں سورۂ قصص کے اس مقام پر لکھتے ہیں:

عن مقاتل ان الرجلین کانا کافرین الا ان احدھما من بنی اسرائیل والآخر من القبط۔

مقاتل سے مروی ہے کہ دونوں لڑنے والے کافر تھے البتہ ایک بنی اسرائیل میں سے تھا اور دوسرا قبطی تھا۔

ابن جوزیؒ بھی اپنی تفسیر زاد المسیر میں ان آیات کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو نہیں چاہیے تھا کہ آپ حکمِ الٰہی کے بغیر قتل کرتے (ان یقتل حتیٰ یؤمر)۔ پھر محدث ابن جوزی حضرت ابنِ عباسؓ کا قول درج کرتے ہیں:

الاسرائیلی الذی اعانہ موسیٰ کان کافراً

جس اسرائیلی کی حضرت موسیٰ نے مدد کی تھی وہ کافر تھا۔

اگر اس بات کو درست نہ سمجھا جائے اور اس اسرائیلی کو مسلمان ہی مانا جائے، تب بھی قرآنِ مجید کے بیان سے یہ امر واضح ہے کہ وہ ایک جھگڑالو اور شوریدہ سر قسم کا انسان تھا، کیونکہ یہ دیکھ لینے کے باوجود کہ اس کے پیچھے ایک آدمی قتل ہو چکا ہے وہ دوسرے ہی روز پھر ایک قبطی سے الجھ پڑا اور حضرت موسیٰؑ کو دیکھتے ہی پھر انہیں مدد کے لیے پکارنے لگا جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ

تو یقیناً بہکا ہوا، بھٹکا ہوا آدمی ہے۔

اس شخص نے مزید غضب یہ کیا کہ جب حضرت موسیٰ اس کے قبطی حریف کو پکڑنے لگے تو یہ اسرائیلی سمجھا کہ شاید مجھ پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں اور فوراً بول اٹھا کہ "اے موسیٰ کیا تو مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے جس طرح تو نے کل ایک شخص کو قتل کیا ہے، تُو تو زمین میں جبار بننا چاہتا ہے مُصلح بن کر نہیں رہنا چاہتا"۔ گویا کہ اس شخص نے احسان کا بدلہ یہ دیا کہ اپنے محسن کا قاتل ہونا فرعون اور اس کی قوم پر ظاہر کر دیا اور حضرت موسیٰ کی گرفتاری اور قتل کا سامان فراہم کر دیا۔ اب یہ بات الگ ہے کہ اللہ کو یہ منظور نہ تھا اور اس نے اپنا ایک دوسرا انیدہ بھیج دیا جس نے حضرت موسیٰؑ کو خبردار کر کے نکل جانے کا مشورہ دیا۔

قبطی کے قتل کا غیر مباح ہونا احادیث سے بھی ثابت ہے۔ شفاعت کے متعلق ایک طویل حدیث

مسلم، کتاب الایمان اور بعض دوسری کتابوں میں مروی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز جب لوگ شفاعت کے لیے حضرت موسیٰ کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے۔

ان ربی قد غضب الیوم غضبًا لم یغضب قبلہ مثلہ ولن یغضب بعدہ مثلہ وانی قتلت نفسًا لم اومر بقتلہ۔

میرا رب آج ایسا ناراض ہے جیسا وہ نہ کبھی پہلے ناراض ہوا، نہ پھر کبھی ہوگا۔ میں نے ایک جان کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہ تھا۔

اس حدیث کی رُو سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہے کہ نبوت سے قبل جس اسرائیلی شریعت کے حضرت موسیٰ پیرو تھے، اس میں بھی اس شخص کا قتل جائز نہ تھا، اس لیے اسے حربی قرار دے کر اس کے قتل کو مباح یا کارِ ثواب سمجھنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ واقعۂ قتل حضرت موسیٰ کو نبوت دیے جانے کے بعد کا ہے۔ سورۂ قصص کا دوسرا رکوع پڑھتے ہوئے بظاہر ایسا شبہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو پہلے حکم و علم عطا ہوا اور بعد میں یہ واقعہ پیش آیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس مقام پر آیات کی ترتیب زمانی نہیں، فقط بیانی ترتیب ہے۔ یا پھر حکم و علم سے مُراد نبوت نہیں، بلکہ وہ قائدانہ صلاحیت و فراست ہے جس سے حضرت موسیٰ نبوت سے قبل ہی نوازے گئے تھے جبکہ آپ فرعون کے ہاں ایک شہزادے کے طور پر پروان چڑھ رہے تھے۔ سورۂ مریم کے شروع میں بھی ایسی مثال موجود ہے کہ پہلے حضرت یحییٰ کو کتاب دینے کا ذکر ہے اور پھر ارشاد ہے کہ ہم نے اسے بچپن ہی میں قوت فیصلہ عطا فرمائی، (واٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا)۔ ورنہ یہ بات تو قرآن و حدیث کی متعدد تصریحات سے ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کو نبوت مصر سے نکل جانے کے کئی برس بعد طورِ سینا پر عطا ہوئی جبکہ آپ کی شادی بھی ہو چکی تھی اور آپ اپنے گھر والوں کو لے کر مصر واپس تشریف لے جا رہے تھے۔ سورۂ شعراء ہی میں حضرت موسیٰ کا قول موجود ہے کہ انہوں نے فرعون سے کہا کہ جب واقعۂ قتل کے ڈر سے میں تمہارے اندر سے نکل کھڑا ہوا تو اللہ نے مجھے "حکم" عطا کیا اور رسولوں کے زمرے میں داخل فرمایا (فَفَرَرْتُ مِنْکُمْ لَمَّا خِفْتُکُمْ فَوَھَبَ لِیْ رَبِّیْ حُکْمًا وَّجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ الشعراء ۲۱)

ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر جو کچھ مولانا مودودی نے اس مقام پر تحریر کیا ہے، وہ اگرچہ مختصر ہے مگر قرآن و حدیث اور علمائے اہلِ سنت کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ میں اس پر مفصل بحث کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مولانا مفتی محمد یوسف صاحب اپنی کتاب "مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ"، حصہ اول (صفحات ۷۴ تا ۹۲) میں اس موضوع پر جو کچھ لکھ چکے ہیں وہ طالبِ حق اور صاحبِ انصاف کے لیے بالکل کافی ہے۔ تاہم دیوبندی علماء کی خصوصی توجہ کے لیے میں یہاں مولانا حسین احمد مدنیؒ کا ایک جواب نقل کیے دیتا ہوں جو انہوں نے مولانا عبدالحمید صاحب مدرسہ اشرف العلوم، گنگوہ کے نام ارسال کیا ہے اور مولانا مرحوم کے مکتوبات جلد دوم ص۲۸۲۔۲۸۳ پر مطبوعہ موجود ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرماتے ہیں:

"وہ مثل فرشتوں اور ارواحِ قدسیہ کے اِن احساساتِ بشریہ اور خواہشاتِ نفسانیہ سے منزّہ اور بے لوث نہیں ہوتے . . . . لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں خیر اور خشیتِ الٰہیہ کا غلبہ ہوتا ہے، حضورِ دائمی جناب باری عزّوجلّ اسمہٗ کا حاصل رہتا ہے جس کی وجہ سے خیر کی رغبت اور شرور سے نفرت اور دُوری رہتی ہے۔ اگر کبھی بمقتضائے طبیعت یا وساوسِ شیطانیہ کسی معصیت کی طرف میلان ہوتا ہے تو حفاظتِ خداوندی اور نگہبانیٔ ربانی رکاوٹ پیدا کر دیتی ہے اور بیچ میں حائل ہو جاتی ہے۔ اسی حیلولہ اور رکاوٹ کا نام عصمت ہے، بخلاف فرشتوں کی معصومیت کے کہ ان کے یہاں ایسی خواہشات کا مادہ ہی نہیں ہوتا۔ ان کا معصوم ہونا ایسا ہی ہے جیسے کہ بچہ اور عنّین میں مادۂ جماع اور رغبت الی النساء کا مادہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان کو معصوم کہنا حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے۔"

فقر و فاقہ اور اُس کا اسلامی حل

از: یوسف القرضاوی ـــ تلخیص و ترجمہ: عبدالحمید صدیقی

ـــــ (۵) ـــــ

نفقاتِ اہلِ قرابت اللہ تعالیٰ نے بچّے کے وارث پر بھی نان و نفقہ کی ویسی ہی ذمّہ داری ڈالی ہے جیسی کہ بچّے کے والد پر۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَکِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُکَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔ (البقرۃ: ۲)

جو باپ چاہیں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک دُودھ پیئے تو (مطلّقہ) مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں۔ اس صورت میں بچّے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔ مگر کسی پر اس کی وسعت سے بڑھ کر بار نہ ڈالنا چاہیے نہ تو ماں کو اس وجہ سے تکلیف میں ڈالا جائے کہ بچہ اس کا ہے اور نہ باپ ہی کو اس وجہ سے تنگ کیا جائے کہ بچہ اس کا ہے۔ دُودھ پلانے والی کا یہ حق جیسا بچّے کے باپ پر ہے ویسا ہی اس کے وارث پر بھی ہے۔

اس حکم خداوندی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی حکم لگایا تھا۔ چنانچہ سعید بن مُسیّب سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بچّے کے پدری رشتہ داروں کو اس بناء پر قید کر دیا تھا کہ وہ بچّے کے نان نفقہ کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے تھے۔ سعید بن مُسیّب ہی سے ایک اور روایت ہے کہ ایک یتیم کا سرپرست حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؓ نے اس سے فرمایا

اس یتیم پر خرچ کرو"۔ پھر فرمایا "اگر مجھے اس یتیم کا دُور پرے کا رشتہ دار ہی مل جاتا تو میں اُس پر اس بچے کا نان نفقہ واجب قرار دیتا"۔ اس سلسلے میں زید بن ثابتؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ "اگر بچے کے ورثاء میں ماں اور چچا ہوں تو ماں پر اس کے حصّۂ وراثت کے مطابق اور چچا پر اُس کے حصّۂ وراثت کے مطابق بچے کا نان نفقہ فرض ہوگا۔ حضرت عمرؓ اور زید بن ثابت کے مذکورہ فیصلوں کی مخالفت کسی صحابی سے ثابت نہیں ہے۔

ابن جُریج فرماتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا کہ وعلی الوارث مثل ذالک کا کیا مطلب ہے تو آپ نے فرمایا "کہ یتیم کے ورثاء پر وارث ہونے کی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اُس پر خرچ کریں"۔ میں نے کہا "اگر بچے کا کوئی مال وغیرہ نہ ہو تو کیا بچے کے وارث کو بچے کی پرورش و پرداخت نہ کرنے کے جرم میں قید کر لیا جائے گا؟" آپ نے فرمایا "کیا وہ اُسے چھوڑ دے گا کہ وہ مرتا رہے؟" حسن بصری فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بچّے کا وارث ہو اُس پر فرض ہے کہ وہ بچے پر خرچ کرے تا آنکہ وہ اپنے وارث کا محتاج نہ رہے"۔ قَتَادہ، مجاہد، ضَحّاک، زید بن اسلم، قاضی شُرَیح، قَبیصہ بن ذوَیب، عبداللہ بن عُتبہ بن مسعود، ابراہیم نخعی، شَعبی اور اصحابِ ابن مسعود اور ان کے بعد سفیان ثوری، عبدالرزاق اور ابوحنیفہ اور اُن کے اصحاب اور پھر ان کے بعد احمد بن حنبل، اسحاق اور داؤد وغیرہ جملہ سلف صالحین نے بھی یہی تفسیر کی ہے جو ابن جریج اور عطا سے منقول ہے۔

خویش و اقارب پر خرچ کرنے کے بارے میں امام ابوحنیفہ کا مسلک خویش و اقارب پر خرچ کرنے کے بارے میں حضرت امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر رحم کے رشتہ داروں میں بیٹے یا پوتے ہوں یا آباؤ اجداد ہوں تو اُن پر خرچ کرنا واجب ہے قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہیں یا کافر۔ اگر ان کے علاوہ کوئی رشتہ دار ہوں تو اُن پر خرچ کرنا صرف اُس صورت میں فرض ہے کہ وہ مسلمان ہوں کیونکہ مسلمان پر یہ واجب نہیں کہ اپنے کسی کافر رشتہ دار پر خرچ کرے۔

اس طرح خرچ کرنے میں دو باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا۔ ایک خرچ کرنے والے کی استطاعت، دوسرے جس پر خرچ کیا جائے اس کی ضرورت و احتیاج۔ اگر وہ شخص جس پر خرچ کیا جا رہا ہے بچّہ ہے یا بوڑھا ہے

یا عورت ہے تو صرف اُن کی تنگدستی کا لحاظ رکھا جائے گا اور اگر وہ مرد ہو تو پھر اس کی تنگ دستی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ وہ اندھا تو نہیں یا اُسے کوئی ایسا مزمن مرض تو نہیں جس نے اُسے بالکل کام کے قابل نہ چھوڑا ہو۔ اور اگر وہ تندرست و توانا ہو اور اندھا نہ ہو تو پھر اس پر خرچ کرنا واجب نہیں یہ نان نفقہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک میراث کے مطابق ہوگا۔ مگر اُن کے مشہور مذہب کے مطابق بچے کا نان نفقہ خاص طور پر والد کے ذمے ہوگا۔ اور حسن بن زیادہ لُؤلُؤِی نے اس قیاس کو عام کرتے ہوتے کہا ہے کہ بچے کا نفقہ ماں باپ دونوں پر اُن کی میراث کے مطابق ہوگا۔

امام احمد بن حنبل کا مسلک | امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر قریبی جو محتاج ہے اور وہ جو مدد کرنے والا ہے دونوں ایک ہی سلسلۂ نسب سے ہوں تو پھر محتاج و ضرورت مند کا نان نفقہ واجب ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ وارث ہے یا غیر وارث۔ اور اگر وہ کسی اور سلسلۂ نسب سے ہو تو پھر نہیں کیونکہ نفقہ کے وجوب کے لیے توارث کی شرط لازمی ہے۔ اگر خویش و اقارب میں سے وہ رحم کے رشتے دار ہوں جو وارث نہیں ہو سکتے تو اُن کے لیے امام احمد سے منقول کسی نصِ صریح کے مطابق کوئی نفقہ نہیں ہے۔ تاہم امام احمد کے بعض اصحاب نے اُن رشتہ داروں کے توارث کے بارے میں امام احمد کے مسلک کی بنیاد پر نفقے کے وجوب کو ثابت کیا ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک نفقہ میراث کا حصّہ ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک خرچ کرنے والے اور وہ جس پر خرچ کیا جا رہا ہے دونوں کا ایک ہی دین پر ہونا نفقہ کے وجوب کے لیے ضروری شرط ہے۔ مگر ایک روایت کے مطابق ان کے نزدیک والدین کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔ جس پر کسی شخص کا نفقہ واجب ہے اس پر امام احمدؒ کے مسلک کے مطابق اس کی بیوی کا نفقہ بھی واجب ہے۔

قاضی ابو یعلیٰ فرماتے ہیں کہ اسی طرح جس پر اپنے رشتہ داروں مثلاً بھائی بھتیجے اور چچا وغیرہ وغیرہ کا نفقہ واجب ہو گیا ہو اس پر اُن کی پاکدامنی کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ جب کسی شخص پر ایک آدمی کی پاکدامنی کا خیال رکھنا ضروری ہے تو اُس پر اس آدمی کی بیوی کا نفقہ بھی واجب ہوگا کیونکہ وہ اسی طرح اپنی پاکدامنی کو قائم رکھ سکتا ہے۔

وجوبِ نفقہ کی شرائط | فقہاء نے اقارب پر نفقہ کے وجوب کو دو شرطوں سے مشروط کیا ہے۔ پہلی شرط

یہ ہے کہ جس کے لیے نفقہ واجب ہے وہ تنگ دست و نادار ہو۔ اگر وہ کہیں سے مال مل جانے کے سبب یا کوئی کام کرنے کی وجہ سے مالدار ہو جائے تو اس کا نفقہ واجب نہیں۔ کیونکہ نفقہ کے وجوب میں صرف ہمدردی و غمخواری اور مدد کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ دولتمند اور فارغ البال ہو جانے کے بعد کوئی اس کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ نفقہ کا انتظام کرنے والے کے پاس اپنے اور اپنی بیوی کے نان نفقہ سے زاید مال ہو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پہلے اپنے آپ پر خرچ کرو پھر اپنے اہل و عیال پر" قریبی رشتہ دار پر خرچ کرنا باہمی ہمدردی کے طور پر ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اپنی اصلی ضرورت سے زاید مال ہو تو اس پر خرچ کیا جائے۔ اصلی ضرورت سے مراد اپنی ذات اور اپنے بال بچوں پر خرچ کرنا ہے۔

نفقہ کن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے اسلام نے خویش و اقارب پر نفقے کا جو حکم دیا ہے اس کے لیے مال کی کوئی حد مقرر نہیں کی کیونکہ زمان و مکان اور حالات کے مختلف ہونے سے لوگوں کی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اسی طرح نفقہ کرنے والوں کے مالی حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی خوش حال و کشادہ رزق ہوتا ہے تو کبھی وہ اوسط درجے کا مالدار ہوتا ہے۔ ان حالات میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ نفقہ کرنے والے کی قوتِ انفاق اور نفقہ کے مستحق کی حاجت مندی، دونوں کا لحاظ رکھا جائے اور رشتہ دار مناسب طریقے سے ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (الطلاق: ۷)

خوشحال آدمی اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی روزی تنگ ہو وہ اس کے مطابق خرچ کرے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ اللہ کسی کو اسی کے مطابق تکلیف دیتا ہے جتنا اللہ نے اس کو دیا ہے۔

وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ (البقرہ: ۲۳۶)

ان کو خوشحال آدمی اپنی مقدرت کے مطابق اور غریب اپنی مقدرت کے مطابق معروف طریقے سے دے۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ

بچے کے باپ کو معروف طریقے سے انہیں کھانا کپڑا

بِالْمَعْرُوفِ ۔ (البقرہ ۔ ۲۳۴) دینا ہو گا ۔

اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو سفیان کی بیوی ہند سے ایک موقع پر کہا تھا کہ اپنے خاوند کے مال سے اتنا لے لے جتنا تجھے اور تیرے بچے کے لیے کافی ہو"

فقہائے اُمت نے نفقہ میں مندرجۂ ذیل چھ چیزوں کو شامل کیا ہے: (۱) کھانا پینا، (۲) گرمی سردی کے لیے حسبِ حال لباس (۳) رہائش اور اس کے لوازمات ۔ (۴) جو شخص اپنا کام خود کرنے کے قابل نہ ہو اس کے لیے نوکر ۔ (۵) جو شادی کا حاجت مند ہو اس کی شادی کا انتظام ۔ (۶) مستحقِ نفقہ کے بیوی بچوں پر بھی خرچ کرنا ۔

شیخ الاسلام ابنِ قدامہ اپنی کتاب الکافی میں فرماتے ہیں: "نفقہ ضرورت مند کی ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے ۔ کیونکہ نفقے کا اصل مقصد حاجت مند کی ضرورت پوری کرنا ہے ۔ اگر اُسے اپنی خدمت کے لیے خادم کی ضرورت ہو تو نفقہ کرنے والے پر خادم کا نفقہ بھی واجب ہو گا ۔ اور اگر اس کی بیوی ہو تو اس کا نفقہ بھی" پھر فرماتے ہیں کہ نفقہ دینے والے پر یہ واجب ہے کہ باپ دادا اور بیٹے وغیرہ، جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہو، ان میں سے اگر کوئی شادی کا خواہاں ہو تو اس کی شادی کر دے ۔ کیونکہ وہ اس کا ضرورت مند ہے اور اس سے محرومی اس کے لیے ضرر رساں ہے ۔ لہٰذا شادی بھی نان نفقہ یعنی کھانے پینے اور لباس کے مشابہ ہے ۔ مگر یہ صحیح نہ ہو گا کہ حاجت مند آدمی کو حقیر سمجھ کر اس کے لیے کسی ایسی عورت کو چھانٹا جائے جو اس کے لیے ناکارہ ہو یا اس کی حیثیت کے مطابق نہ ہو ۔

نفقہ کے سلسلے میں علاج معالجے کے وجوب کے متعلق فقہاء کا کوئی قول نہیں ہے ۔ لیکن ہمارے خیال میں جس شخص پر کسی حاجت مند رشتہ دار کے نفقہ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو اس پر اس کے علاج کی ذمہ داری عائد نہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے ۔

نفقہ علی الاقارب صرف اسلام ہی کا خاصہ ہے | اسلام نے دولت مند رشتہ دار پر اپنے غریب اور نادار رشتہ دار کا نان نفقہ واجب قرار دے کر معاشرتی تحفظ (SOCIAL SECURITY) کی بنیاد رکھی ہے ۔ اسلام نے اِسے محض مستحب قرار نہیں دیا ہے بلکہ ایک ایسا حق کہا ہے جس کے ادا کرنے کا

حکم خود ذاتِ باری تعالیٰ نے دیا ہے۔ فقہِ اسلامی میں کتاب النفقات کے تحت رشتہ دار پر خرچ کرنے کے باب میں جو احکام دیئے گئے ہیں میرا خیال ہے کہ ایسے احکام نہ پرانی شریعتوں میں کہیں ملیں گے اور نہ آج کل کے جدید قوانین میں کہیں اس کا خیال تک پایا جاتا ہے۔ اسلام نے غریب و تنگ دست مسلمان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے امیر و خوشحال رشتہ داروں پر نان نفقے کا دعویٰ دائر کر دے۔ یہ وہ حق ہے جسے ہم اسلامی معاشرہ میں ایک معمولی اور قدرتی بات سمجھتے ہیں، کیونکہ ہم نے اسے دین ہونے کی حیثیت سے جانا ہے اور بڑے بوڑھوں سے وراثت میں پایا ہے۔ مگر غیر مسلم قومیں جنہیں ہم تہذیب و ثقافت کے میدان میں بہت ترقی یافتہ سمجھتے ہیں، ان کے لیے یہ بات بڑی حیرت انگیز اور باعثِ تعجب ہے۔ ہمارے استاد ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ اپنی کتاب "اسلام اور انسانی دنیا کو اس کی ضرورت" میں اسلام اور عائلی زندگی پر گفتگو فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاید یہ بہتر ہو اگر میں یہاں یہ ذکر کر دوں کہ میں قیامِ فرانس کے دوران جس گھر میں کچھ عرصہ رہا وہاں ایک نوجوان لڑکی بحیثیت خادمہ کے رہا کرتی تھی جس کے چہرے سے خاندانی شرافت کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے گھر کی مالکہ سے پوچھا کہ یہ لڑکی کیوں خادمہ بنی ہوتی ہے؟ کیا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار نہیں جو اس سے یہ کام چھڑوا دے اور اس کے لیے زندگی کی آسائشیں فراہم کر دے"؟ اس نے جواب دیا کہ یہ لڑکی شہر کے ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا ایک چچا ہے جو بڑا مالدار ہے۔ مگر وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اپنے معاملے کو عدالت میں کیوں نہیں لے جاتی کہ وہ اسے چچا سے نان نفقہ دلوائے؟ میری بات سے وہ صاحبہ حیران رہ گئیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کے تحت یہ لڑکی اپنے چچا سے ایسا کوئی مطالبہ کر سکے"۔ تب میں نے انہیں اس سلسلے میں اسلام کا حکم سمجھایا۔ وہ کہنے لگیں "کون ہے جو ہمارے لیے ایسا قانون بنائے؟ اگر ہمارے یہاں یہ قانونی لحاظ سے جائز ہو تو کوئی لڑکی یا عورت ایسی نہ ملے جو کسی کمپنی، کارخانے یا فیکٹری یا حکومت کے کسی محکمے میں کام کرنے کے لیے گھر سے نکلے"۔ (باقی)

سوڈان کے اندرونی حالات پر ایک نظر

زین الدین رکابی اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ المیثاق الاسلامی خرطوم

[زین الدین رکابی نے یہ مضمون خاص طور پر ماہنامہ ترجمان القرآن کے لیے ارسال کیا ہے۔ موصوف نے سوڈان کے جو حالات قلمبند کیے ہیں وہ ان کے عینی مشاہدات پر مبنی ہیں۔ وہ خود سوڈان کی سیاسی زندگی میں دخیل رہ چکے ہیں۔ اور اسلامی تحریک کی ترقی اور فروغ میں قابلِ قدر خدمات انجام دے چکے ہیں۔ روزنامہ المیثاق الاسلامی کے چیف ایڈیٹر رہے ہیں جسے موجودہ انقلابی حکومت نے بند کر دیا ہے۔ سوڈان کے موجودہ حالات پر ان کا یہ مضمون بڑا بصیرت افروز ہے۔ ادارہ]

سوڈان اور باہر کی دنیا کے سیاسی مبصرین کا یہ خیال تھا کہ اس ملک میں اسلامی شعور اور اسلامی تحریک نے سرکاری سطح پر بھی اور عوامی پیمانے پر بھی ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیانی عرصہ میں کافی ترقی کی ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو سوڈان کی عوامی تحریک برپا ہوئی تھی جس نے جنرل ابراہیم عبود کی عسکری آمریت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اور مئی ۱۹۶۹ء میں موجودہ انقلابی حکومت وجود میں آئی۔ ان چار سالوں کے اندر اسلامی بیداری اور اسلامی اثرات کو متعدد اسباب کی بنا پر پھیلنے پھولنے کا کافی موقع ملا۔ سیاسی مبصرین ذیل کے واقعات اور حقائق کو اپنے مذکورہ تاثر اور نقطۂ نظر کی تائید میں پیش کرتے تھے:

۱۔ ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۹ء کے درمیانی عرصہ میں یہاں ایک عظیم الشان اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ یہ یونیورسٹی نہ صرف سوڈان کے اندر مرکزی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی بلکہ پورے

افریقہ کے لیے امیدوں کا مرکز بننے والی تھی۔

۲۔ دستوری طور پر کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تھا اور ملک کے اندر اس کی سرگرمیوں پر شدید قدغن لگا دی گئی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں علانیہ گستاخی کی تھی۔

۳۔ اسلامی تحریک خوب سرگرم ہو گئی تھی۔ اس کے ارکان اور حامیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پارلیمنٹ کے اندر بھی اس کے حامی پہنچ گئے تھے۔ اس نے ایک روزانہ اخبار بھی جاری کر لیا تھا جو سوڈان کا سب سے بڑا اور مضبوط اخبار سمجھا جاتا تھا۔

۴۔ سوڈان میں عالمِ اسلام کے بڑے بڑے متعدد رہنماؤں نے دورے کیے تھے، مثلاً انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی کے رہنما ڈاکٹر محمد ناصر، جماعت اسلامی کراچی کے امیر چوہدری غلام محمد مرحوم اور الجزائر کے نامور اسلامی مفکر مالک بن نبی وغیرہ۔ ان حضرات نے سوڈان میں تقریریں کیں اور نوجوانوں کو اسلام اور اسلامی جہاد کی ترغیب دی۔ نوجوانوں کے اندر ان تقریروں نے غیر معمولی اثر کیا۔

۵۔ شمالی سوڈان اور جنوبی سوڈان کی تمام سیاسی پارٹیوں نے اِس امر پر اتفاق کر لیا تھا کہ ملک کے لیے ایک متوازن اور معتدل دستور وضع کیا جائے جو ملکی اتحاد اور بنیادی آزادیوں کی ضمانت دیتا ہو۔ اور شریعتِ اسلامی کو قانون سازی کا ماخذ و منبع ٹھیراتا ہو، اور ملک کے اندر ایسی فضا پیدا کرے جس میں نئی نسل صحیح اخلاقی اور تعلیمی نشوونما حاصل کر سکے۔

۶۔ ۵ مئی ۱۹۶۹ء کو، یعنی موجودہ انقلاب کے برپا ہونے سے بیس روز پہلے تمام سیاسی پارٹیوں نے اپنے نمایندوں کو جو دستور ساز کمیٹی کے اندر موجود تھے، یہ تاکید کر دی تھی کہ وہ دستوری مواد سے متعلق اپنی بحث و تمحیص اور دوسرے ضروری اقدامات کو تیز تر کر دیں۔ دستور کے اعلان کے لیے دسمبر ۱۹۶۹ء کی آخری مدت بھی مقرر کر دی گئی تھی۔

دوسری جانب سوڈان کی سیاسی اور فکری سرگرمیوں پر نظر رکھنے والے یہ مشاہدہ بھی کر رہے تھے کہ سوڈان کے اسلام دشمن عناصر اسلامی اثرات کی ترقی سے چیں بجبیں ہو رہے ہیں، اور اُن حلقوں

کو بھی طرح طرح کے اندیشے لاحق ہو رہے تھے جو باہر سے سوڈان کی بائیں بازو کی تحریک کی رہنمائی اور پشت پناہی کر رہے تھے۔ انہیں یہ پریشانی لاحق تھی کہ اسلامی تحریک کی رو تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور سوڈانی قوم اُس کا تیز رفتاری کے ساتھ خیر مقدم کر رہی ہے۔ یہ حالات دیکھ کر کمیونسٹ اور ان کے انصار و اعوان ہر تدبیر سے اسلامی شعور کی مزاحمت پر تُل گئے تھے۔ لیکن مجموعی طور پر اسلام کے خلاف اُن کی یہ مذموم مہم کامیاب نہیں ہو رہی تھی کیونکہ عوام الناس اسلام کی حقیقت کو اور کمیونزم کی اصلیت کو بھی سمجھ چکے تھے اور انہیں کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ کمیونزم اور سوشلزم کی اشاعت کے پس پردہ کیا کیا سیاسی اغراض پنہاں ہیں۔ لوگ اُس مُلحد عنصر سے بھی روشناس ہو چکے تھے جو کمیونزم کو کمک سپلائی کر رہا تھا اور اُس کی سرپرستی کا فرض سرانجام دے رہا تھا۔ چنانچہ جب کمیونسٹوں نے اسلامی رَو کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پایا اور سوڈانی قوم کو وہ راہِ خدا سے منحرف کرنے میں خائب و خاسر ہو گئے تو ان تمام عناصر نے جن میں مقامی کمیونسٹ بھی شامل ہیں اور بلاد بیرونی کمیونسٹ بائیں بازو والے بھی، ناصر پرست بھی اور اُن کے بیرونی رہنما اور اساتذہ بھی، ملی بھگت کر لی اور یہ اسکیم تیار کر لی کہ وہ کسی طرح سوڈانی عوام کی اُن آرزوؤں اور امنگوں کو پامال کریں جو وہ ایک ایسے روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے دلوں میں پروان چڑھا رہے ہیں جس میں اسلام کی حکمرانی ہو گی اور بنیادی حقوق کی مکمل ضمانت فراہم ہو گی اور ملکی وحدت کا استحکام ہو گا اور آئندہ نسلیں تباہی سے محفوظ رہیں گی۔ ان لوگوں کی یہ ناپاک چال ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء کے انقلاب کی صورت میں کامیاب ہو گئی۔ یہ انقلاب اپنا چہرہ چھپائے بغیر صاف صاف عوام کے سامنے نمودار ہو گیا۔ اس کی فطرت اور اس کے رجحانات کو سمجھنے میں لوگوں کو کسی غیر معمولی کاوش کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مزید برآں اس انقلاب نے ایسی عملی دلیلیں بھی فراہم کر دیں جن کی بنا پر لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا کہ یہ انقلابی حکومت سراسر کمیونسٹ ہے خواہ وہ کوئی سا نعرہ اختیار کرے۔

اس انقلابی حکومت نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جس میں اُس نے اسلام کے خلاف اپنے ناپاک عزائم کو نافذ نہ کیا ہو۔ چنانچہ انقلابی حکومت نے اپنی اسلام دشمنی کی ابتدا وزارتی کابینہ میں

کمیونسٹوں کو داخل کرنے سے کی۔ ۲۴ وزیروں کی مجلس میں ۱۰ وزیر کمیونسٹ لیے گئے۔ وزیر اعظم ڈاکٹر عوض اللہ بھی کمیونسٹ تھا۔ یہ آج کل جعفر نمیری کا نائب ہے اور الحاد پسندی میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ ہر مذہبی چیز سے اس کو انتہائی عداوت ہے۔ باقی وزراء گو کمیونسٹ نہ تھے لیکن ان سب کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔ یہ تو اختیارات کی تقسیم سے متعلق ہوا لیکن نظریاتی اور سیاسی پہلو سے انقلابی حکومت نے اسلام کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا اُس سے اُس کی اسلام دشمنی کھلا ثابت ہوتی ہے۔

انقلابی حکومت نے اُم دُرمان کی اسلامی یونیورسٹی کو کلیتہ بند کر دیا جو افریقہ میں سب سے بڑا اسلامی ادارہ تھا۔ اسلامی دستور منسوخ کر دیا گیا۔ جعفر نُمیری نے اسلامی دستور کی تنسیخ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "یہ ایک عظیم اور دُور رس انقلابی فیصلہ ہے جسے انقلابی حکومت نے بروقت سرانجام دیا ہے"۔ علیٰ ہذا القیاس انقلابی حکومت نے اسلامی تحریک کے داعیوں کو خاص طور پر اپنا نشانہ بنا لیا اور انہیں جیلوں اور حوالاتوں میں بھرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ آج سینکڑوں کی تعداد میں جیلوں کے اندر موجود ہیں۔ ثانوی اسکولوں میں اسلامیات کے مضامین کو خارج کر دیا گیا۔ سوڈان کی یونیورسٹیوں اور ثانوی اسکولوں میں مارکسزم کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ انقلابی حکومت نے معاشرے کے اندر طبقاتی جنگ کی طرح ڈال دی اور ہو بہو اس فلسفے پر عملدرآمد شروع کر دیا جو طبقاتی کشمکش برپا کرنے کے لیے مارکس نے بیان کیا ہے۔

تمام سوڈانی قوم نے ماسوائے اُن کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں کے جن کو فوج میں اثر و رسوخ حاصل ہے حالیہ انقلاب کی شدید مخالفت کی ہے اور پہلے ہی اُس کی مخالفت کا علم بلند کر دیا کیونکہ یہ انقلاب غیر دستوری اور آمرانہ ہے۔ مختلف قومی میدانوں کے اندر جوں جوں انقلابی حکومت کے ناروا تصرفات اور مستبدانہ اقدامات اور غیر اسلامی فیصلے وجود میں آتے گئے۔ ردّ عمل کے طور پر انقلابی حکومت کی مخالفت زیادہ نمایاں ہوتی گئی اور اس کی طاقت میں زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ اوپر ہم یہ بتا چکے ہیں کہ عوام کی مخالفت کا ایک اہم سبب انقلابی حکومت کے ملحدانہ نظریات اور اس کی

اسلام دشمنی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی طور پر بھی اس انقلاب نے ایسے ناروا اقدامات کیے جن کی بنا پر اسلامی عناصر کے سوا دوسرے تمام سیاسی لوگوں کے لیے بھی اِس انقلاب کی مزاحمت کرنا فرض ہو گیا، کیونکہ مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ انقلابی حکومت کی عقل و ہوش سے عاری سیاست کہیں پُورے ملک کو تباہ و برباد کر کے نہ رکھ دے۔

یہ بات تمام باخبر لوگوں کو معلوم ہے کہ جنوبی سوڈان کے مسئلے نے سوڈان کو طرح طرح کی مشکلات میں گرفتار رکھا ہے اور یہ مسئلہ سوڈان کی ترقی اور خوشحالی کے راستے کا روڑا بنا چلا آ رہا ہے۔ بڑی تگ و دو اور شدید جانفشانی اور صعوبت کے بعد شمالی سوڈان اور جنوبی سوڈان کے سیاسی لیڈر اس مسئلے کے بارے میں چند بنیادی اور جوہری سمجھوتوں پر متفق ہو گئے تھے۔ یہ سمجھوتے طویل المیعاد تھے اور یہ طے پا چکا تھا کہ انہیں ملک کے مستقل دستور کے اندر شامل کر لیا جائے گا اور یُوں اس مسئلہ کا خاتمہ عمل میں لایا جائے گا۔ ان سمجھوتوں کی رُو سے ان لیڈروں نے یہ قرار دیا کہ قومی وحدت کی حدود کے اندر رہ کر صوبائی نظام قائم کیا جائے گا جس میں سوڈان کے موجودہ نو ڈویژن شامل ہوں گے۔ نیز یہ بھی انہوں نے طے کیا کہ جنوبی سوڈان کی ترقی پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ اور تمام مذاہب کے لوگوں کے شخصی حقوق کی دستور میں ضمانت دی جائے گی۔ تاکہ نہ مسلم اکثریت کی طرف سے کسی کے حق میں زیادتی ہو اور نہ عیسائی اقلیت کی طرف سے زیادتی کا موقع باقی رہے۔ انقلاب سے ۱۹ روز پہلے سوڈان کے شمالی لیڈروں اور جنوبی لیڈروں دونوں کی طرف سے ان سمجھوتوں کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا اور انہیں دستوری مسودہ میں بھی شامل کر دیا گیا۔ شمال اور جنوب کے لوگ مسئلے کے بہترین حل کی خوشی میں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے۔ مگر سوشلسٹ انقلاب نے ان تمام کوششوں پر یکایک پانی پھیر دیا اور اس جان لیوا مسئلے کو از سرِ نو چھیڑ دیا۔ انقلابی حکمرانوں نے جنوب کے حقیقی رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور جنوب کے ایک کمیونسٹ کو جو خود جنوب کے اندر پچھلے انتخابات میں شکست فاش کھا چکا تھا امورِ جنوب کا وزیر بنا دیا۔ اس کے نتیجے میں وہی حوادث برپا ہوئے جن کی توقع تھی۔ جنوبی باشندوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور از سرِ نو اپنے حقوق کا مطالبہ کھڑا کر دیا۔ عوام کے حقوق نہ صرف جنوب میں بلکہ شمال میں

بھی پامال کیے گئے۔ قومی اتحاد یکسر مجروح ہو گیا۔ اور ملک ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔

انقلابی حکومت کی دوسری بڑی حماقت فنی قابلیتوں کا ضیاع ہے۔ یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں ہے کہ سوڈان ایک پسماندہ ملک ہے اور خام مال اور سرمائے سے زیادہ وہ فنی ماہرین کا محتاج ہے۔ سوڈان کے پاس فنی ماہرین کی اس قدر قلت ہے کہ وہ کسی نوع بھی ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا بلکہ بعض پہلوؤں میں تو سوڈان آج تک خود کفیل نہیں ہو سکا ہے۔ مختصر یہ کہ سوڈان اگر ترقی سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو اُسے فنی ماہرین کو دانتوں سے پکڑ کر رکھنا ہوگا۔ مگر موجودہ انقلابی حکمرانوں کو اپنے اقتدار کے سوا کسی اور پہلو سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ ان حکمرانوں نے صرف اس بنا پر کہ وہ لوگوں کی وفاداری کو مشکوک سمجھتے ہیں لاتعداد اہلِ علم اور اہلِ فن کو ملک بدر کر دیا ہے۔ ہر سرکاری محکمے سے چُن چُن کر ایسے اشخاص کو نکالا گیا اور نکالا جا رہا ہے جن پر انہیں انقلاب کی مخالفت کا شبہ ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، فاضل ترین جج، ماہرینِ تعلیم، ماہرینِ زراعت کی کثیر تعداد کو ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا ہے اور انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ان کی جگہ ایسے نااہل، ناکارہ اور شورش پسندوں کو بھرتی کر لیا گیا ہے جو تالیاں بجانا تو خوب جانتے ہیں مگر کام سے نابلد ہیں۔ اس کے نتیجے میں ملک کی رفتارِ یکدم رک گئی ہے اور اجتماعی زندگی اضطراب کا شکار ہو چکی ہے۔

ملک کے اندرونی معاملات میں ناصری حکومت اور روس کی طرف سے بھی کھلم کھلا دخل اندازی کی جا رہی ہے۔ ملک پھر اُن حالات سے دوچار ہو گیا ہے جو اینگلو مصری حکومت کے دور میں پائے جاتے تھے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ سوڈانیوں نے اینگلو مصری اقتدار سے نجات پانے کے لیے اور وطن کو حقیقی آزادی سے ہمکنار کرنے کے لیے طویل جنگ لڑی ہے۔ اینگلو مصری حکومت کے خلاف سوڈانیوں کے اندر شدید نفرت اور غصہ پایا جاتا تھا اس لیے وطن کی آزادی و استقلال پر انہیں غیر معمولی خوشی اور فخر تھا۔ ان حالات میں جب کہ وہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے رہے تھے، یکایک انقلابی حکومت نے ملک کو ایک نئے دوہرے اقتدار یعنی رُوسی ناصری اقتدار کے قبضہ میں دے دیا۔ اب یہ نیا روسی ناصری اقتدار باہر سے سوڈان پر حکومت کر رہا ہے اور سوڈان کا ہر

باشعور شخص یہ جانتا ہے کہ تمام ملکی معاملات قاہرہ اور ماسکو کی طرف سے سرانجام دیئے جا رہے ہیں عین اس وقت جب رومانیہ یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ اپنی آزاد اور مستقل پالیسی پر ملک کی تعمیر کریگا۔ اور روس کا بستۂ فتراک بن کر نہیں رہے گا جعفر نمیری یہ اعلان کرتا ہے کہ "سوڈان روس کو ودیعت کر دیا گیا ہے" اور "دنیائے عرب کی قیادت کا مرکز قاہرہ ہے"۔

سوڈانی عوام صاف صاف یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ان کے ملک کو بیرونی نفوذ کے آگے سرنگوں کیا جا رہا ہے۔ فوج اور سیکورٹی پولیس کے لیے ماہرین روس اور مصر سے منگوائے گئے ہیں اور انہیں عوام کو کچلنے اور وطن پسندوں کا قلع قمع کرنے کے پورے اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ خارجہ پالیسی میں روس اور ناصر کی علی الاعلان خیمہ برداری کی جا رہی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ روس اور ناصر نے یہ سازش کی تھی کہ جدہ میں وزرائے خارجہ کی اسلامی کانفرنس کو سبوتاژ کیا جائے۔ چنانچہ سوڈان کے نمائندے نے اس کانفرنس کو ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اسی طرح تعلیم، پریس اور تجارت کے میدانوں میں بھی دو طاقتی حکومت (روسی مصری حکومت) کی ہدایات کے تحت عملدرآمد ہو رہا ہے اور سوڈانی باشندے یہ صورتِ حال صاف صاف دیکھ رہے ہیں۔ تجارت کا تو یہ حال ہے کہ اب سوڈان صرف روسی اور مصری سامان کی منڈی بن چکا ہے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ روس اور مصر کا مالِ تجارت جو سوڈان میں بک رہا ہے نوعیت کے لحاظ سے انتہائی ناقص اور قیمت کے لحاظ سے انتہائی گراں ہے۔

سوڈان میں پچھلے دنوں جو خونریز واقعات رونما ہوئے ہیں اُن سے پہلے ہی سوڈانی عوام ایسے محرکات و جذبات سے بھرے ہوئے تھے جو انقلابی حکومت کے خلاف انہیں بھڑکا دینے کے لیے کافی تھے۔ لوگوں کے دل انقلابی حکمرانوں کے خلاف غیظ و غضب سے کھول رہے تھے۔ اس غیظ و غضب میں دو خطرناک اسباب نے مزید اضافہ کر دیا:

۱۔ اقتصادی حیثیت سے ملک مکمل دیوالیہ ہو گیا۔ کرنسی ختم ہو گئی اور حکومت کو سونے کے محفوظ ذخیرہ کے بغیر ہی کاغذی نوٹ چھاپنے پڑے۔ اشیائے صرف غائب ہو گئیں کیونکہ ایک طرف

درآمدات پر ناقابلِ تصور کسٹم ڈیوٹی عائد کردی گئی اور دوسری طرف تاجروں نے کاروبار بند کردیا۔ حالات کو مزید اس بات نے خراب کر دیا کہ حکومت نے سرکاری ملازموں اور مزدوروں کی تنخواہوں میں بہت بڑی کمی کر دی۔ اب ایک طرف تو دیسی ساخت کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں کیونکہ اجنبی مال کی درآمد بند کی جاچکی تھی، اور دوسری طرف گوشت، بچوں کی غذا، کپڑے اور دواؤں کی قیمتوں کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ چائے تو مارکیٹ سے بالکل ہی غائب ہو چکی ہے۔ مکئی جو سوڈان کی بہت بڑی پیداوار ہے اس کی قیمت میں بھی چار گنا اضافہ ہو گیا۔ تمام ترقیاتی منصوبے معطل ہو چکے ہیں اور لازمی سروسز کی اسکیمیں سرد خانے میں ڈالی جا چکی ہیں، کیونکہ حالیہ اشتراکی انقلاب نے ان منصوبوں اور اسکیموں کو مغربی امداد سے محروم کر دیا ہے۔ اب صرف کمیونسٹ بلاک پر سارا انحصار ہے۔ مگر اس بلاک کے وعدے بھی سراب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ پورا کمیونسٹ بلاک اور بالخصوص روس ہولناک اقتصادی بحرانوں سے دوچار ہے۔ اس تباہ کن اقتصادی بحران کا سامنا کرنے کے لیے انقلابی حکومت نے ایک نرالا ہتھکنڈا استعمال کیا اور وہ یہ تھا کہ تنخواہوں میں اضافہ یا اشیاء کی قیمتوں میں کمی کرنے کے بجائے ایسے خونریز حوادث کو جنم دیا گیا جن کی وجہ سے لوگ اپنے معاشی مصائب بھول جائیں اور عسکری احکام کے چکر میں پڑ جائیں۔

۲۔ دوسرا خطرناک سبب جس نے عوام کے غصّے میں مزید اضافہ کیا وہ سہ طاقتی اتحاد کی تشکیل ہے۔ یہ سہ طاقتی اتحاد جو مصر، سوڈان اور لیبیا پر مشتمل ہے گو "اتحاد" کے نام سے قائم کیا گیا ہے مگر سوڈانی عوام اسے بیرونی طاقتوں کی سازش سمجھتے ہیں۔ سوڈانیوں کے نقطۂ نظر سے یہ موضوع انتہائی نازک ہے۔ سوڈان کے لوگ مصر کی ناصری حکومت کے تجربات سے آگاہ ہیں۔ یہ سہ طاقتی اتحاد اُن کی نظر میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جمال عبدالناصر کی حکومت جن شدید داخلی مشکلات میں گھری ہوئی ہے اُن کا حل نکالا جائے اور اس غرض کے لیے سوڈان کو قربانی کا بکرا بنایا جائے۔ اِس "اتحاد" کا حاصل یہ نکلا ہے کہ عبدالناصر نے ۱۵ لاکھ مصریوں کو سوڈان کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہ ۱۵ لاکھ مصری سویز اور پورٹ سعید کے باشندے ہیں۔ اسرائیل نے ان کو وہاں سے نکال دیا ہے پہلے یہ قاہرہ کے کیمپوں

میں رہ رہے تھے۔ مگر قاہرہ کی گنجان آبادی ان کی متحمل نہ ہو سکی۔ اس لیے انہیں "اتحاد" کے پردے میں سوڈان بھیج دیا گیا ہے۔ اس اتحاد کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سوڈان کی زرعی اراضی کو نقصان پہنچا کر مصر نے نیل کے پانی کی زیادہ سے زیادہ مقدار اپنے لیے مختص کر لی ہے۔ اور اس "اتحاد" کا تیسرا مطلب یہ واضح ہوا ہے کہ سوڈان کی قومی زندگی اور قومی روایات کو برباد کیا جا رہا ہے۔ سوڈانی قوم کے باہمی برادرانہ تعلقات کے تار و پود بکھیرے جا رہے ہیں۔ اس غرض کے لیے پریس کے وسائل کو استعمال کیا جا رہا ہے اور نظامِ جاسوسی کی نئی تشکیل کی جا رہی ہے۔ جس طرح دوسرے اشتراکی ممالک کے معاشرے برباد ہو چکے ہیں اور ان میں لوگوں کا باہمی اعتماد ختم ہو چکا ہے، وہی کچھ سوڈان میں کیا جا رہا ہے۔ اس پوری تباہی کے عوض جعفر نمیری کو چند جہاز اور جاسوسی کے ماہرین کا ایک گروہ دیا گیا ہے تاکہ اندرونی مخالفین سے اس کی حفاظت کی جا سکے۔

مصر اور سوڈان کے تعلقات کے نقطۂ نظر سے یہ صورتِ حال بہت نازک اور گہرے سیاسی اور اجتماعی اثرات کی حامل تھی۔ اسی وجہ سے امام ہادیؒ نے جمال عبدالناصر کے نام ایک ٹرا زوردار اور تلخ مراسلہ بھیجا۔ امام ہادی اس وقت اپوزیشن لیڈر تھے اور ملکی آزادی کی راہ میں ان کے آباؤ اجداد نے جو خدمات سرانجام دی تھیں۔ اُن کی وجہ سے انہیں ملک کے اندر غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی۔ امام ہادی نے اپنے مراسلہ میں جمال عبدالناصر کو سوڈان کے بارے میں انتقامی سیاست اختیار کرنے پر متنبہ کیا اور اس سیاست کے نتیجے میں وادیٔ نیل کی دو قوموں کے درمیان تعلقات خراب ہو جانے کی ذمہ داری جمال عبدالناصر پر ڈالی۔ امام ہادی کے مراسلے کا ایک اقتباس یہ ہے:

> "ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اتحاد کا انکار نہیں کر سکتا۔ بحیثیت مسلمان ہم ایک امّت ہیں۔ لیکن ہر شخص اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ سیاسی نفوذ و اثر کو جبراً دوسروں پر ٹھونسا جائے۔ آپ اس جبر کو وحدت کا نام دیتے ہیں۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فوجی حکومت خواہ وہ مصر کی ہو یا سوڈان کی دونوں قانونی اور دستوری جواز سے محروم ہیں۔ دوسروں کے معاملات میں تو ہم دخل نہیں دیتے، لیکن جہاں تک ہمارا تعلق

ہے ہمارے ملک میں اس وقت جو فوجی حکومت قائم ہے وہ غیر دستوری ہے اور وہ سوڈانی عوام کی قطعاً نمائندہ نہیں ہے۔ اگر ملک کے اندر شہری آزادیاں بحال کر دی جائیں اور آزادانہ انتخابات کروا دیئے جائیں تو یہ اختلاف ختم ہو سکتا ہے۔ انتخابات کا جو نتیجہ بھی برآمد ہو ہم اُسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ موجودہ نظام سوڈانی قوم کی قطعاً نمائندگی نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں اس حکومت کی طرف سے جو حکم بھی صادر ہوگا وہ قوم کی رائے نہیں ہوگی، نہ وہ قوم کے رجحانات اور مطالبات کا ترجمان ہوگا اور نہ وہ سوڈان کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات کی نوعیت طے کرنے کا مجاز ہوگا۔

نیز یہ نام نہاد اتحاد جو سوڈان اور مصر اور لیبیا کے درمیان قائم کیا گیا ہے اس کی بنیادیں سراسر ظلم پر قائم ہیں اور سوڈان کے مفادات کو پامال کرتی ہیں۔ لہٰذا میں اپنے ملک کی اپوزیشن پارٹیوں کی طرف سے ہر اُس قرارداد یا اقدام کو مسترد کرتا ہوں جو سوڈان کو غیر ملکی اقتدار کے آگے جھکاتی ہو خواہ اُس کے لیے کیسا ہی عنوان تجویز کیا گیا ہو۔ اس خطرناک اقدام کی جو "اتحاد" کے نام سے اٹھایا گیا ہے تمام تر ذمہ داری آپ پر ڈالتا ہوں۔ میرے نزدیک ہمارے ملک کی اور آپ کے ملک کی بہتری اس میں ہے کہ ہم معاملات پر غور و خوض سے کام لیں اور دُور رس نتائج کا گہرا مطالعہ کریں۔"

ناصری حکومت نے امام ہادی کے اس مراسلے کو فوراً جعفر نُمیری کو بھیج دیا اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ "امام کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے جو سوڈان کی حکومت کو خاطر میں نہیں لاتا اور اُس نے ریاست کے اندر ریاست قائم کر رکھی ہے۔" ناصر کے خط میں سوڈان کی انقلابی حکومت سے یہ وعدہ بھی کیا گیا: "امام ہادی کی طرف سے جو رجعت پسندانہ چیلنج دیا گیا ہے اُس کا قلع قمع کرنے کے لیے ہم انقلابی حکومت کی پُوری پُوری امداد دیں گے۔"

نُمیری اس وقت شامی صدر نورالدین آتاسی کی دعوت پر شام کے دورہ پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مگر اُس نے یکایک یہ دورہ منسوخ کر دیا اور سفید نیل کے علاقے کا دورہ شروع کر دیا تاکہ

وہاں چھڑ خانی کی جا سکے، کیونکہ اس علاقہ کی اکثریت امام ہادی کی حامی ہے اور اسی علاقہ میں جزیرہ ابا واقع ہے جو امام کی پناہ گاہ تھا۔ جعفر نمیری نے سفید تیل کے دورہ پر روانگی سے پیشتر ملک کے اندر ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا، فوج اور سیکورٹی پولیس کو تیاری کے احکام جاری ہو گئے، اور ناصر کے مشورہ کے تحت جزیرہ ابا پر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ایک سازش کے تحت یہ افسانہ گھڑا گیا کہ نمیری پر چاقو سے حملہ ہوا ہے۔ یہ اسی نوعیت کا افسانہ ہے جو جمال عبدالناصر نے مصر کے اخوان المسلمون کو ٹھکانے لگانے کے لیے گھڑا تھا۔

جزیرہ ابا کے خونیں واقعات سے پہلے مصر کی انٹیلی جنس کا چیف امین حویدی سوڈان پہنچ گیا تاکہ جزیرہ ابا پر حملے کے منصوبے میں شرکت کر سکے۔ نہایت قابلِ اعتماد ذرائع کا کہنا ہے کہ حویدی نے جعفر نمیری سے کہا: "صدر عبدالناصر اور مصری فضائیہ کے افسران کی یہ خواہش ہے کہ ابا کی جنگ میں مصری فضائیہ کو نہایت مضبوط اور فیصلہ کن حصہ لینا چاہیے۔ ابا کی جنگ سویز اور سینا پر اسرائیل کے حملوں کا جواب دینے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔"

آخر کار جزیرہ ابا کا محاصرہ کر لیا گیا، بکتر بند گاڑیاں اور پیادہ فوج گشت کرنے لگی اور خونریزی شروع ہو گئی۔ لیکن الانصار جو جانفشانی میں مشہور رہی بری جنگ کا انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حملہ آوروں سے کچھ اسلحہ بھی چھین لیا۔ قوم کے قاتلین نے محسوس کیا کہ اس طرح کے ہتھیاروں سے الانصار کا سامنا کرنے کا انجام بہت برا ہو گا۔ چنانچہ اسی اثنا میں ہوائی جہازوں کے دستے متواتر پہنچ گئے جن کی قیادت روسی اور مصری اور عراقی ہوا باز کر رہے تھے۔ ہوائی جہازوں نے مکانات اور مسجدوں پر بمباری شروع کر دی، عورتوں اور بچوں کو نشانہ بنایا، اور ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری جانب سے بھاری بھرکم میدانی توپوں کے دہانے جزیرہ ابا پر کھول دیے گئے جو ۵ کیلومیٹر کے فاصلے سے جزیرہ پر گولہ باری کرتی رہیں۔ ہوائی جہازوں نے امام کے ٹھکانے کو خصوصی نشانہ بنایا اور اسے تباہ کر دیا اور امام اپنے مرکزی مقام کے اندر ہی شہید ہو گئے۔ یہ سفید جھوٹ ہے کہ امام حدودِ حبشہ کے پاس شہید ہوئے ہیں۔ انقلابی حکومت نے الانصار کو رسوا کرنے اور ان کے روحانی اثرات پر ضرب لگانے کے لیے یہ سراسر جھوٹا افسانہ تراشا اور دنیا میں پھیلایا ہے۔

خود دارالحکومت خرطوم میں بھی الانصار اور انقلابیوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ خرطوم کا ایک محلہ جس کا نام "ودنوباوی" ہے اور جس کی آبادی الانصار پر مشتمل ہے اس میں انقلابیوں کے دستے داخل ہوئے اور انہوں نے محلے کو گھیرے میں لے لیا۔ مگر الانصار نے اُس سب کو ختم کر دیا۔ حکومت کی طرف سے مزید کمک بھیجی گئی۔ مگر الانصار نے اُسے بھی ناکام کر دیا۔ آخر میں ٹینک بھیجے گئے جنہوں نے پورے محلے پر گولہ باری کر کے مردوں، عورتوں، بچوں اور مسجدوں الغرض ہر چیز کو اڑا دیا۔ اس محلے کے مقتولین کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔

یہ بات خصوصی توجہ کی مستحق ہے کہ عین اس وقت جب یہ خونین ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا مصر سے جمال عبدالناصر کے نائب انوار سادات اور لیبیا سے معمّر قذافی کے نائب عبدالسلام جلود خرطوم پہنچ گئے اور وہ مسلح افواج کے ہیڈکوارٹر میں بیٹھے رہے۔ جعفر نمیری اور انقلابی کونسل کے ارکان ان کے ساتھ تھے۔

یہ راز کھلنے پر کہ اس جنگ میں نُمیری کے مفاد کی خاطر بیرونی طاقتوں نے دخل اندازی کی ہے عوام کے اندر انقلابی حکومت کے خلاف شدید نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ فوج کے بعض افسر بھی غیظ و غضب میں آگئے۔ اور انقلابی حکومت خطرناک سیاسی اُلجھن سے دوچار ہو گئی۔ چنانچہ اُس نے پروپگنڈے کے کمیونسٹ اور ناصر پرست ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور اس المیہ پر پردہ پوشی کے لیے پروپگنڈے کی تیز تر مہم جاری کر دی۔ چنانچہ یہ پروپگنڈا کیا گیا کہ اس جنگ میں صرف سوڈانی فوج نے حصہ لیا ہے، مصری فضائیہ اور روسی اور عراقی ہواباز شریک نہیں ہوئے ہیں اور اُلٹا یہ کہا گیا کہ مخالفین نے ایک بیرونی طاقت کی امداد حاصل کی تھی۔ مگر سوڈانی عوام پر اس بے بنیاد پروپگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سوڈان کا ہر فرد سمجھتا ہے کہ بیرونی طاقتوں کے اشارے پر اور ان کی مدد سے نُمیری نے یہ سب کچھ کیا ہے۔

سوڈان کی اپوزیشن میں ہر سوڈانی شریک ہے ماسوائے کمیونسٹوں اور ناصر پرستوں اور بائیں بازو والوں کے۔ یہ تینوں عناصر بھی عوامی طاقت کے مقابلے میں اقلیت ہیں۔ سوڈان کی آبادی

۱۵ ملین (ڈیڑھ کروڑ) ہے۔ اور ان میں کمیونسٹوں اور بائیں بازو سے شغف رکھنے والوں کی تعداد ۶۰ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جو مصری یہودیوں کے شاگرد ہیں یا جنھوں نے مشنری مدارس اور مستشرقین کے اداروں میں تعلیم پائی ہے۔ ۱۹۶۸ء کے انتخابات میں یہ تناسب واضح ہو گیا تھا۔ پارلیمنٹ کی ۲۴۰ نشستوں میں سے کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں کو صرف ایک نشست پر کامیابی ہوئی۔ چنانچہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ موجودہ کمیونسٹ حکومت کی مخالف تمام قوم ہے۔ شمال کے لوگ بھی اور جنوب کے لوگ بھی۔ اس بات کو سیاسی پارٹیوں کے اثرات بخوبی واضح کرتے ہیں:

۱۔ اُمّہ پارٹی: یہ الانصار کی سیاسی تنظیم ہے اور الانصار کے علاوہ دوسرے محب وطن عناصر بھی اس میں شریک ہیں۔ صرف الانصار کی تعداد ۴ ملین (۴۰ لاکھ) ہے جن میں اکثریت زراعت پیشہ ہے اور تعلیم یافتہ طبقے اور تاجروں کے اندر بھی ان کے مضبوط حلقے ہیں۔ تاریخی طور پر الانصار وہ گروہ ہے جس نے مہدی سوڈانی کی دعوت پر لبیک کہا تھا اور ایک اسلامی ریاست کے قیام میں اُن کی مدد کی تھی اور بدعات و خرافات کے استیصال اور ملت کے اتحاد اور دنیائے اسلام کو غیر اسلامی اقتدار سے نجات دلانے کے لیے ان کی حمایت کی تھی۔ امام مہدی کے بعد امامت کا منصب پہلے ان کے جانشین عبداللہ التعاشی کو ملا، پھر مہدی کے بیٹے امام عبدالرحمٰن اس منصب پر فائز ہوتے۔ امام عبدالرحمٰن نے سوڈان کی آزادی میں سب سے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ امام عبدالرحمان کے بعد یہ منصب امام مہدی کے پہلے پوتے امام صدیق اور پھر دوسرے پوتے امام ہادی (جو اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں) کو ملا۔ امام صدیق اور امام ہادی دونوں بھائی تھے۔ امام ہادی مرحوم دینداری اور پاسِ عہد اور حق پر ثابت قدمی اور شجاعت و مردانگی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی یہی خوبیاں اندرونی اور بیرونی دشمنوں کو ان کے خلاف سازشوں پر اکساتی رہیں۔

۲۔ نیشنل یونینسٹ پارٹی۔ یہ سوڈان کی دوسری بڑی پارٹی ہے اور عددی قوت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے اُمّہ پارٹی کے بعد دوسرے درجہ پر ہے۔ اس پارٹی کے حامیوں کی تعداد بھی کثیر ہے۔ تاجروں،

مزدوروں اور ملازمین کے اندر اس کے اثرات زیادہ ہیں بعض زرعی علاقوں میں بھی اس کے حامی پائے جاتے ہیں۔ آزادئ وطن اور انگریز کے خلاف جہاد میں اس پارٹی کی خدمات بھی نمایاں ہیں۔ اسماعیل ازہری مرحوم اس کے صدر تھے۔ اسماعیل ازہری کی وفات کے بعد اس کی قیادت شریف حسین ہندی کے ہاتھ میں آئی۔ موجودہ انقلابی حکومت کے خلاف یہ اپوزیشن کا نہایت طاقتور اور جری نمائندہ ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ وزیر خزانہ تھے۔ خود شریف ہندی کے اپنے ماننے والوں کی تعداد بھی نیلگوں نیل کے علاقے میں بے شمار ہے۔ شریف ہندی کا تعلق اُس گھرانے سے ہے جس نے مہدی سوڈانی کی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

۳۔ اسلامک چارٹر فرنٹ: یہ وسیع و عریض محاذ ہے جس میں اخوان المسلمون کے علاوہ دوسری اسلامی تنظیمیں اور اسلام پسند افراد بھی شامل ہیں۔ محاذ کے اثرات کا خاص حلقہ تعلیم یافتہ طبقہ، ملازمین، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، مدرسین، علماء اور طلبہ ہیں۔ شمالی سوڈان اور جنوبی سوڈان میں بھی محاذ کے حامیوں کی کثیر تعداد ہے۔ ۱۹۶۸ء کے انتخابات میں محاذ نے جنوبی سوڈان میں بھی ایک نشست جیت لی تھی۔ محاذ کی قیادت ڈاکٹر حسن تُرابی کے ہاتھ میں ہے۔ ڈاکٹر ترابی اونچے پائے کے ماہرِ آئین ہیں۔ خرطوم یونیورسٹی کے لا کالج میں پروفیسر تھے۔ پھر لا کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے۔ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر حسن ترابی ہی نے جنرل ابراہیم عبود کی فوجی آمریت کے خلاف انقلاب کا افتتاح کیا تھا اور فوجی نمائندوں کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیا۔ یہاں تک کہ فوج حکومت سے دست بردار ہوگئی اور ملک کے اندر جمہوری زندگی بحال ہوگئی۔ اس کامیاب تبدیلی کے بعد ڈاکٹر حسن ترابی کلیتہً سیاسی میدان میں کام کرنے لگے۔ ڈاکٹر ترابی نے خرطوم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور اس کے بعد پیرس یونیورسٹی سے دستوری قانون میں ڈاکٹریٹ کیا۔ موصوف جدید علوم میں بھی نہایت عمدہ دسترس رکھتے ہیں، اسلامی علوم کا بھی گہرا مطالعہ حاصل ہے، اور سیاست میں بھی یدِ طُولیٰ رکھتے ہیں۔ عربی زبان کے علاوہ وہ انگریزی اور فرانسیسی کے بھی بہترین ماہر ہیں۔ اس وقت موصوف جیل میں بند ہیں۔ ان پر ابھی تک سرے سے کوئی الزام ہی نہیں لگایا گیا ہے۔

۴۔ جنوبی سوڈان کے مختلف عناصر: جنوبی سوڈان میں دو بڑی سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک سانو پارٹی اور دوسری جنوبی محاذ پارٹی۔ یہ دو پارٹیاں ہی درحقیقت جنوب کی صحیح نمائندہ ہیں۔ اور یہ دونوں پارٹیاں دستور سازی، ملکی سالمیت اور جمہوریت کے مسائل پر شمالی سوڈان کی پارٹیوں سے مکمل اتفاق رکھتی ہیں۔

الغرض شمالی سوڈان کی تین بڑی جماعتوں اور جنوبی سوڈان کی دو بڑی جماعتوں سے سوڈان کی اپوزیشن عبارت ہے۔ دوسرے لفظوں میں موجودہ انقلابی حکومت اس وقت پوری قوم کے مقابلے میں کھڑی ہے۔ حق پرست اکثریت اور غاصب اقلیت کے درمیان ابھی تک شدید کشمکش برپا ہے۔ اور یہ نام نہاد انقلابی حکومت محض روس، مصر اور لیبیا کی مدد کے بل پر کھڑی ہے، ورنہ قوم میں اس کی کوئی جڑ نہیں ہے۔

رسائل و مسائل

کیا حضرت عُزیر نبی تھے؟

(ملک غلام علی صاحب)

سوال: ان دنوں بعض علمائے کرام مولانا مودُودی اور جماعت اسلامی کے خلاف توہینِ انبیاء کا الزام بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مولانا کی تفسیر تفہیم القرآن حصہ دوم کی سورۂ توبہ کا ایک حاشیہ ۲۹ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں حضرت عُزیر کو کاہن کہا گیا ہے حالانکہ سارے مفسرین انہیں پیغمبر شمار کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی نبوت کا انکار بھی ہوتا ہے اور توہین بھی۔ اس حاشیے میں اگرچہ حضرت عُزیر کو مُجدّد کہا گیا ہے اور یہ بھی لکھا گیا ہے کہ حضرت عُزیر نے بائیبل کے پُرانے عہد نامے کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی، مگر حضرت عُزیر علیہ السّلام کی نبوت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ سورۂ بقرہ کے ایک مقام پر بھی جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک نبی کا گزر ایک بستی پر ہوُا جو ویران کھنڈر پڑی تھی تو انہوں نے کہا کہ اس مُردہ بستی کو اللہ پھر کیسے زندہ کرے گا اور اللہ نے ان پر موت وارد کر دی اور وہ سو سال تک مردہ پڑے رہے اور پھر زندہ ہوئے، یہ بھی حضرت عُزیر ہی تھے مگر مولانا مودُودی نے یہاں بھی نہیں لکھا کہ یہ نبی حضرت عزیر علیہ السّلام تھے۔ براہ کرم ان اعتراضات کی حقیقت پوری طرح واضح کی جائے کہ حضرت عُزیر کا ذکر قرآن یا حدیث میں کس حیثیت سے کہاں کہاں آیا ہے اور وہ نبی تھے یا نہیں؟

جواب: قرآن مجید کی کسی آیت یا حدیث کی کسی صحیح روایت میں اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ

حضرت عزیر نبی تھے۔ قرآن مجید میں عُزَیر کا لفظ صرف ایک مقام (سورۂ توبہ۔ آیت ۳۰) میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ بقرہ آیت ۲۵۹ میں جس شخص کا ذکر ہے، اس کے متعلق بھی بعض مفسرین کا بیان ہے کہ یہاں حضرت عزیر ہی مراد ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں اس مقام پر نہ کسی نام کی تصریح کی گئی ہے، نہ اس شخص کے نبی ہونے کی صراحت فرمائی گئی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں:

اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ — یا مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گزر ایک بستی پر ہوا۔

کوئی ارشادِ نبوی بھی ایسا موجود نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ اس آیت میں کسی نبی کا ذکر ہے اور وہ نبی حضرت عُزیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہ شخص کون تھے اور نبی تھے یا نہ تھے چنانچہ تفسیروں میں ان کا نام عُزیر، ارمیا بن حلقیا، خضر، حزقیل وغیرہ مذکور ہے اور بعض نے رجل من بنی اسرائیل (بنی اسرائیل کا کوئی فرد) لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ پھر جن حضرات نے حضرت عزیر نام تحریر کیا ہے ان میں سے بھی بعض نے یہی لکھا ہے کہ یہ یہود کے ایک ذی علم مُصلح تھے، نبی نہ تھے۔ مثلاً علامہ نظام الدین نیسابوری اپنی تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کے ذیل میں مذکورہ بالا اسماء و اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

روی عن ابن عباس ان بُختنصر غزا بنی اسرائیل فسبی منہم الکثیر ومنہم عزیر وکان من علمائہم۔ — حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بُخت نصر نے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کی بہت بڑی تعداد کو غلام بنا لیا جن میں ایک عزیر تھے جو ان کے علماء میں سے تھے۔

بہرکیف یہاں قرآن مجید نے جن صاحب کی مثال دی ہے، ان کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ کے نبی تھے اور ان کا نام عُزیر تھا۔ اس آیت میں آگے یہ بھی بیان ہے کہ اللہ نے ان پر ایک سو برس تک موت طاری کر دی اور بظاہر یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک نبی جو فریضۂ نبوت سرانجام دے رہے ہوں، ان پر اتنے طویل عرصے تک ایسی حالت گزرے جو کارِ تبلیغ میں مانع ہو۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن جریر سارے نام ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: لاحاجۃ بنا الی معرفۃ اسمہ (ہمیں ان

بزرگ کا اسم گرامی جاننے کی ضرورت نہیں، پھر قرآن کریم کے اسلوب بیان کا تقاضا بھی ہے کہ اس میں جس شخصیت کا ذکر ایک بار نام کے تعین کے ساتھ آجائے اور وہ شخصیت نبی کی ہو تو پھر کسی دوسرے مقام پر ان کا ذکر ایسے غیر متعین الفاظ یا انداز میں نہ ہو جیسا کہ سورۂ بقرہ کے اس مقام پر ہے۔

قرآن مجید کا دوسرا مقام جہاں حضرت عُزیر کے نام کی صراحت ہے، وہ سورۂ توبہ کی آیت ۳۰ ہے۔ اس میں الفاظ یہ ہیں:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُنِ ابْنُ اللهِ اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔

اس مقام پر بھی حضرت عُزیر کے نبی ہونے کی تصریح نہیں ہے۔ صرف یہودیوں کا قول نقل کیا گیا ہے۔ مولانا مودودی نے اس آیت پر جو حاشیہ لکھا ہے اس میں بھی انہوں نے اپنی طرف سے کوئی بات بیان نہیں کی، بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ یہودی انہیں اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں اور اسرائیلی روایات کے مطابق بابل کی اسیری میں انہی عزیر نے توراۃ کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔ اس عبارت میں جہاں مولانا نے "کاہن" کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے حضرت عُزیر کی توہین یا استخفاف کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ دراصل بائبل میں ان کا ذکر "عزرا کاہن" ہی کے نام سے کیا گیا ہے اور کاہن یہودی مذہب کی ایک اصطلاح ہے جو پریسٹ (PRIEST) کے معنی میں مستعمل ہوتی ہے اور یہ ان کے ہاں ایک مقدس مذہبی منصب ہے۔ مولانا کا مدعا یہ ہے کہ عزیر (عزرا) جو ان کے ہاں دینی پیشوا سمجھے جاتے تھے، انہیں بعد میں خدا کا بیٹا بنا لیا گیا۔ عربی لغت کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں بھی کاہن کے سات آٹھ معانی آتے ہیں جن میں بعض کے ساتھ ذم کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ حاشیۂ تفہیم القرآن کا سیاقِ کلام اور انداز بیان صاف بتا رہا ہے کہ وہاں یہ لفظ بُرے معنی میں نہیں بلکہ اچھے اور قابلِ تعریف و تحسین معنوں میں آیا ہے۔

مولانا مودودی نے بالکل صحیح اور بجا طور پر اگرچہ حضرت عُزیر کی نبوت کے متعلق نفیاً یا اثباتاً کچھ نہیں لکھا، لیکن انہوں نے نہ صرف اس مقام پر بلکہ ایک دوسرے مقام (تفہیم القرآن کی اسی جلد دوم ص۵۹۹) پر دوبارہ حضرت عُزیر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"حضرت عُزیر نے دینِ موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہودی

قوم کے تمام اہلِ خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتبِ خمسہ کو، جن میں توراۃ تھی، مرتب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانینِ شریعت کو نافذ کر کے ان اعتقادی اور اخلاقی بُرائیوں کو دُور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں۔ ان تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے اور بنی اسرائیل سے از سرِ نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔"

حضرت عُزیر کے کارنامہ ہائے اصلاح و تجدید کا اس انداز میں ذکر کرنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ تفہیم القرآن میں حضرت عُزیر کی تحقیر و توہین کی گئی ہے، تو اس کی بات ہرگز لائقِ التفات نہیں ہے۔ اب میں آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک ارشاد گرامی پیش کرتا ہوں جو سنن ابی داؤد، کتاب السنّہ، باب التخییر بین الانبیاء میں اس طرح مروی ہے:

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ادری اُتّبّعٌ لعین ھوام لا وما ادری اعُزَیرٌ نبیٌ ھو ام لا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "مَیں نہیں جانتا کہ (قبیلۂ حِمیَر کا پہلا بادشاہ) تُبّع قابلِ لعنت ہے یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ عزیر نبی تھے یا نہیں؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد کا مدّعا یہ ہے کہ قومِ سبا کی جس شاخ نے یمن میں چار سو سال تک حکمرانی کی تھی یہ قوم بعد میں تو مجرم ہو گئی (جیسا کہ قرآن میں صراحت ہے)، لیکن جو شخص خاندان تُبّع کا بانی تھا، معلوم نہیں کہ وہ بھی مجرم و ملعون تھا یا نہیں۔ اس طرح آنحضورؐ نے فرمایا کہ مَیں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ عُزیر جنہیں یہود ابن اللہ کہتے ہیں، وہ نبی تھے یا نہیں؟ یہ قولِ رسول اپنی جگہ پر بالکل ناطق اور قولِ فیصل ہے۔ حضرت عُزیر کے نبی ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے میں جب قرآن و حدیث ساکت ہیں، تو پھر کسی شخص کو یہ حق کس طرح پہنچتا ہے کہ وہ دوسروں سے ان کی نبوت تسلیم کرنے پر اصرار کرے؟

مطبوعات

مجموعہ قوانین اسلام حصہ سوم | تالیف: جناب تنزیل الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ صفحات ۲۵۰، کاغذ اعلیٰ طباعت ٹائپ۔ قیمت مجلد پندرہ روپے۔ ناشر: ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی (پاکستان) اسلام آباد

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی نے علمی اور دینی اعتبار سے اب تک اگر کوئی مفید کام کیا ہے تو وہ ان مجموعۂ قوانین اسلام کا یہ قابلِ قدر سلسلہ ہے۔ اس سلسلے کی پہلی دو جلدوں پر ترجمان القرآن" میں تبصرہ آ چکا ہے۔ یہ تیسرا حصہ نسبِ اولاد، حضانت، نفقات، ہبہ اور وقف پر مشتمل ہے۔

اس حصے میں بھی فاضل مصنف نے پہلی دو جلدوں کا سا انداز اختیار کیا ہے۔ یعنی ہر مسئلے کے بارے میں فقہی مذاہب، اُن کے دلائل، اسلامی ممالک کے قوانین اور پاکستانی عدالتوں کے نظائر کا بڑی دیدہ وری سے جائزہ لیا ہے اور پھر بحث و تفتیش کے بعد انہیں جو مسلک کتاب و سنت سے اقرب اور مصالحِ امت کے نقطۂ نظر سے بہتر نظر آیا ہے اُسے قانون کی حیثیت سے درج کر دیا ہے۔

مصنف کی وسعتِ مطالعہ، سلامتیٔ فکر، اور ذوقِ تحقیق کے باوجود بعض مقامات محلِ نظر ہیں جن پر مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم بطورِ مثال چند مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

حقِ حضانت کے بارے میں مذاہبِ اربعہ نقل کرتے ہوئے فاضل مصنف نے حنفیہ کے مذہب کو ترجیح دی ہے۔ مگر مذہبِ حنفیہ کے ایک استثناء کو انہوں نے قانون کا درجہ دے دیا ہے جیسے کہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"مگر لازم ہے کہ حقِ حضانت میں بچے کی فلاح و بہبود اور حفاظت کا لحاظ رکھا جائے" (دفعہ ۱۵۴)

—— خاص حالات میں تو یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن اسے قانون کا درجہ دینے سے ہمارے خیال میں بہت سی لاینحل پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ پھر فلاح و بہبود اور حفاظت کے الفاظ

بھی مجمل و مبہم ہیں۔

اسی طرح نفقہ اولاد کے معاملے میں باپ کی تنگدستی کی صورت میں فاضل مصنف نے حنابلہ کا مذہب اختیار کرتے ہوئے اس کی ذمہ داری ماں پر ڈالی ہے۔ یہ استثنائی صورت میں تو قابل عمل ہے مگر اسے قانون کا درجہ دینے سے بہت سے دوسرے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔

فاضل مصنف نے تنسیخ ہبہ کے بارے میں ص۱۱۵ پر علامہ نوویؒ کی عبارت نقل کرتے ہوئے غلطی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کے شارح امام نوویؒ نے لکھا ہے "مذکورہ بالا حدیث میں جو کراہت بیان کی ہے تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے"۔ علامہ نووی کی یہ عبارت رجوع ہبہ کی حدیث کے ماتحت نہیں ہے بلکہ ایک دوسری حدیث فقال لا تبتعہ ولا تعد فی صدقتک کے تحت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی کو گھوڑا ہبہ کیا تھا، انھوں نے چند دنوں کے بعد دیکھا کہ وہی شخص گھوڑا بیچ رہا ہے تو آپ نے اُسے خریدنے کا ارادہ فرمایا اور اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا: لا تبتعہ ولا تعد فی صدقتک۔ اس کے تحت علامہ نوویؒ لکھتے ہیں:

ھٰذا النھی تنزیہ لا تحریم۔ یعنی ہبہ کی ہوئی چیز کا خریدنا مکروہ تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے۔

رجوع فی الھبہ کی جو حدیث فاضل مصنف نے نقل کی ہے اس حدیث کے تحت علامہ نووی لکھتے ہیں: ھٰذا ظاھر فی تحریم الرجوع فی الصدقۃ والھبۃ بعد القبض۔ اس چیز کو صحیح مسلم مع شرح نووی مطبوعہ اصح المطابع دہلی کے ص۳۶ جلد دوم میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ان چند گزارشات کے باوجود فاضل مصنف کی محنت قابلِ داد ہے۔ اس عظیم کام کو سرانجام دے کر وہ پوری امتِ مسلمہ کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ اگر اس کتاب پر نظرثانی کے لیے چند بالغ نظر علماء اور ماہرینِ قانون کی خدمات حاصل کر لی جائیں اور اُن کے مشوروں کے بعد اسے شائع کیا جاتا تو یقیناً یہ کام ایک بلند پایہ معیاری کام کا درجہ حاصل کر لیتا۔ فاضل مصنف تنہا اس فرض کو جس خلوص اور احساسِ ذمہ داری سے ادا کر رہے ہیں وہ قابلِ صد ستائش ہے اور باری تعالیٰ کے ہاں اجرِ عظیم کا مستحق۔

(بقیہ اشارات)

اس کے متعلق یہ بات تو پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وقت کی نبضوں پر اس کا ہاتھ نہیں ہے اور وہ ابھی تک اس کام کی اہمیت نہیں سمجھ سکی ہے۔ جس جماعت کے پاس صحیح اسلامی ذہن تیار کرنے کے لیے کوئی نقشہ اور پروگرام اور کوئی علمی سرمایہ نہیں اس سے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل قریب میں دین کے تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کرسکے گی۔

کسی جماعت کی اسلام سے وابستگی کے دعوے کی تصدیق کے لیے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا اس کی اسلام سے محبت کا دعویٰ کوئی ہنگامی نعرہ ہے یا وہ فی الحقیقت عرصہ دراز سے اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے کام کر رہی ہے۔ اسلام کبھی نعروں سے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک بڑا صبر آزما کام ہے جس کا پہلا مرحلہ قلب و دماغ کی تطہیر اور سیرت سازی ہے اور دوسرا مرحلہ عملی سیاست میں سرگرمی ہے۔ ان مراحل کے درمیان اگرچہ کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جاسکتی اور بسا اوقات یہ تینوں کام ساتھ ساتھ ہی کرنے پڑتے ہیں، مگر کوئی دینی جماعت سیاسی کام کے ساتھ ساتھ افکار و نظریات کی تطہیر، عقائد کو راسخ کرنے اور سیرت سازی کے کاموں سے کبھی غافل نہیں ہوسکتی۔ کسی صحیح دینی جماعت کی یہ بنیادی ضرورت ہے۔ اب یہ جائزہ لینا قوم کا کام ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کونسی جماعت ان سارے کاموں کی طرف مسلسل توجہ دیتی رہی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ کونسی جماعت اس ملک کے عوام سے گہری محبت رکھتی ہے اور کون انہیں جہنم کی آگ میں جھونک دینے کے درپے ہے۔

جس فرد یا جماعت کو اپنے بھائیوں سے محبت ہو وہ کبھی بھی ان کے خون کی پیاسی نہیں ہوتی بلکہ وہ

دل وجان سے اس بات کی آرزومند رہتی ہے کہ ملک میں امن وامان قائم رہے، کوئی طاقت ور کسی کمزور پر ظلم اور زیادتی نہ کرے، کوئی فرد یا گروہ اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہونے پائے اور کوئی چالاک اور عیار شخص یا طبقہ اپنی عیاری کے بل بوتے پر سادہ لوح عوام پر عرصۂ حیات تنگ نہ کرے۔

جو لوگ اس ملک میں طبقاتی منافرت کی آگ بھڑکا رہے ہیں یا جلاؤ گھیراؤ کے ذریعے ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں انہیں ملک وملت سے آخر کیا محبت ہو سکتی ہے اور اسلام سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟

جو لوگ ملت کے اس وقت "بڑے غم خوار" بنے پھرتے ہیں ان میں سے بیشتر کا حال یہ ہے کہ انہوں نے قومی مصائب کے موقع پر مصیبت زدہ افراد سے عملی ہمدردی تو کیا زبانی ہمدردی کے اظہار سے بھی گریز کیا ہے۔ کیا ہم اتنے بے بصیرت ہو گئے ہیں کہ ہم اپنے ان "اکیشنی بہی خواہوں" کو اچھی طرح پہچان بھی نہیں سکتے؟

ووٹ دیتے وقت اس بات کا جائزہ لینے کی بھی ضرورت ہے کہ اس جماعت کو کامیاب بنانے کی کوشش کی جائے جو پاکستان کے مختلف حصوں کو جوڑ سکے، خصوصاً مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک مضبوط رشتۂ اتحاد قائم کر سکے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام وہی جماعت کر سکتی ہے جو علاقائی، نسلی، لسانی اور دنیوی مفادات سے بلند ہو کر خالص اسلام کی بنیاد پر ملک کو متحد اور سربلند کرنے کا عزم رکھتی ہو۔ دوسرے اس کی شاخیں ملک کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہوں اور اس کے کارکن ہر جگہ اتحاد کی علامت بن کر سرگرم عمل ہوں۔

اگر مندرجہ بالا امور کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جائے تو انشاء اللہ وہ فیصلہ صحیح ہوگا اور اسی میں ملک وملت کی فلاح وبہبود ہوگی۔

فون نمبر: ۵۲۵۰۷

مرتد کی سزا

سید ابوالاعلیٰ مودودی

- تبدیلیٔ مذہب کے بارے میں اسلامی قانون کی مفصل اور مدلل تشریح۔
- ماہرینِ قانون، طلباء، اور ہر مسلمان کے لیے ایک اہم کتاب۔
- قیمت ـــــ ۲۵/۱ روپیہ

- تقدیر کیا ہے؟
- تدبیر کس حد تک کارگر ہوتی ہے؟
- مسئلہ تقدیر کا زندگی سے تعلق؟
- اِن اہم سوالات کا اطمینان بخش جواب

مسئلہ جبر و قدر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ـــــ میں مطالعہ فرمائیے

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲۵/۲ روپے ـ سستا ایڈیشن ۶۰/۱ روپیہ

اسلام

- کیسا اِنسان چاہتا ہے؟
- اس کی تعلیمات کیا ہیں؟
- ان کو سمجھنے کے لیے

نشری تقریریں

سید ابوالاعلیٰ مودودی

میں ملاحظہ فرمایئے

قیمت
اعلیٰ ایڈیشن ۵۰/۲ روپے
سستا ایڈیشن ۷۵/۱ روپیہ

- ختمِ نبوت کی اہمیت

اور

- اجرائے نبوت کے مضمرات سمجھنے کے لیے

قادیانی مسئلہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مطالعہ کیجئے

قادیانی مذہب کے عقائد و افکار پر معرکہ آرا کتاب

قیمت ۲۵/۱ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ